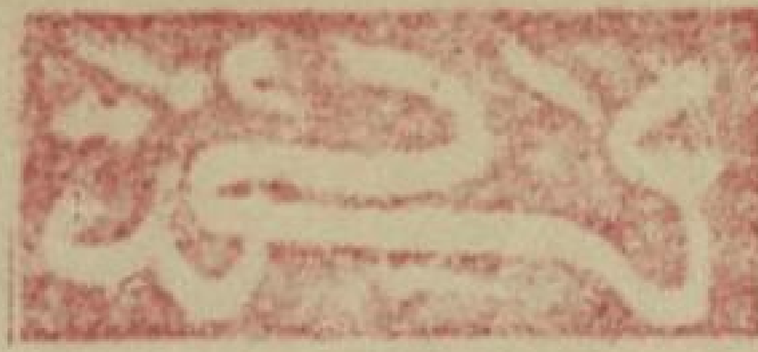
تذکرہ

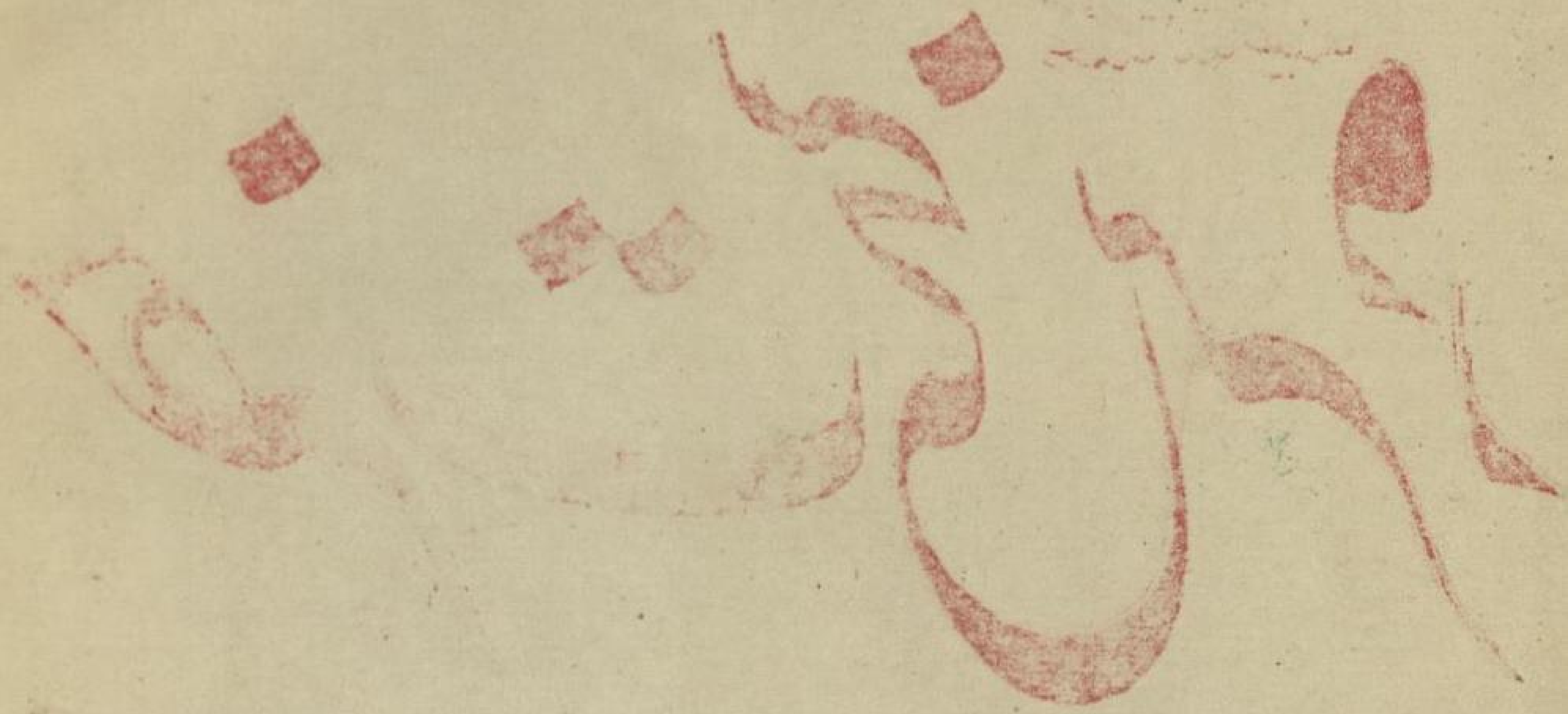
حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ

تالیف

پروفیسر حامد خاں حامد

محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور





أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(القرآن الحکیم)

تذکرہ

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ

تالیف

پروفیسر حامد خاں حامد

پیش لفظ

محمد یوسف گورایہ

علماء اکیڈمی - محکمۂ اوقاف - پنجاب - لاہور

۱۹۷۵ء

۱۳۹۵ھ





ناشر : : شعبۂ مطبوعات، علماء اکیڈمی
محکمۂ اوقاف، پنجاب، لاہور

تعداد : ایک ہزار

طبع اوّل : ۱۹۷۵ء / ۱۳۹۵ھ

مطبع : دین محمدی پریس لاہور

قیمت : [illegible] روپے

ملنے کا پتہ : علماء اکیڈمی (شعبۂ مطبوعات) محکمۂ اوقاف، پنجاب
حضوری باغ (بادشاہی مسجد)
لاہور



انتساب

عقیدتمندانِ حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیشِ لفظ

محکمۂ اوقاف پنجاب نے سلف صالحین اور بزرگان دین کی اہم یادگاروں کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ، اس امر کا بھی شدّت سے احساس کیا کہ بزرگوں کے چھوڑے ہُوئے علمی و دینی ورثہ کی حفاظت اور اس کے فروغ کا بھی اہتمام کرے۔

محکمۂ اوقاف یہ ضروری سمجھتا ہے کہ بزرگانِ دین کے تذکرے، تعلیمات اور مکتوبات کو شائع کیا جائے اور اوّلیت بزرگان دین کی تالیفات، مکتوبات اور ملفوظات کے متون کی اشاعت کو دی جائے۔ اس کے بعد ان کے اُردو تراجم طبع کیۓ جائیں تاکہ ہر شخص ان سے مستفید ہو سکے۔

محکمۂ اوقاف پنجاب اب تک حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز تصنیف "کشف المحجوب" کا فارسی متن، حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، فوائد الفواد (فارسی)۔ فوائد الفواد (اُردو ترجمہ)۔ مکتوبات امام ربّانی مجدّد الف ثانی رح (فارسی) اور مجدد الف ثانی رح کا تذکرہ، حضرات القدس (فارسی) کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کر چکا ہے۔

بزرگانِ دین کی شخصیات اور تعلیمات پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ عام طور پر زبانی روایات کا مجموعہ ہیں۔ محکمۂ اوقاف، بزرگانِ دین کی شخصیات اور ان کی علمی و دینی خدمات پر جو مواد شائع کر رہا ہے، اس میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ وہ مستند اور بحوالہ ہو۔

"تذکرہ سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح اور تعلیمات کے بارے میں مستند مواد پیش کیا جائے۔

انشاءاللہ دیگر بزرگان دین کے تذکروں اور ملفوظات کی اشاعت میں سند اور اور حوالہ کو خاص اہمیت حاصل ہوگی، تاکہ عوام ان کی علمی و دینی خدمات سے آگاہ ہوں اور ان کی تعلیمات سے روشنی حاصل کریں۔

ہمیں اُمیّد ہے کہ اہل علم و دانش اس خالص علمی و دینی مشن کو آگے بڑھانے میں محکمۂ اوقاف پنجاب کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔

محکمۂ اوقاف پنجاب مولانا محمد عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کا شکر گزار ہے، جنہوں نے تذکرہ سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کے مسودے پر نظر ثانی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

محمد یوسف گورایہ

ڈائریکٹر علماء اکیڈمی۔ محکمۂ اوقاف پنجاب

بادشاہی مسجد لاہور

مقدّمہ

حضرت سخی سرور بلاشبہ برصغیر پاک و ہند خصوصًا پنجاب کے اولیائے کبار اور صُوفیائے عظام میں سے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل آپ کا حلقۂ اثر اتنا وسیع تھا کہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب قوموں کے لوگ اس میں نظر آتے تھے۔ مسلم، ہندو اور سکھ، سبھی آپ کی عقیدت کا دم بھرتے تھے۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ آپ کی اتنی عظمت اور بزرگی کے باوجود بہت کم ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو آپ کے صحیح نام یا حالات سے واقف ہوں اور اکثر لوگ آپ کو صرف اس لیے جانتے ہیں کہ ڈیرہ غازیخاں میں ہر سال آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس لاعلمی کا سبب یہ ہے کہ آپ کے حالات و کوائف پر تاریکی کے دبیز پردے پڑے ہُوئے ہیں۔ معاصرانہ تذکرے تو اس سلسلے میں بالکل خاموش ہیں۔ بعد کی کتب میں جو کچھ بیان ہُوا ہے وہ ایسی منتشر اور پراگندہ حالت میں ہے کہ اسے قرینے سے سمیٹنا انتہائی مشکل کام ہے۔

آج تک کسی کو یہ خیال پیدا نہیں ہُوا کہ آپ کے سوانح حیات مرتّب کرے۔ اس موضوع پر کوئی تنتیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور نے ڈیرہ غازیخاں سے شائع کرایا ہے لیکن اس کی تحقیقی، تاریخی یا ادبی اہمیت کچھ نہیں ہے۔ اس میں کچھ فرسودہ روایات اور دو چار کرامات کے سوا کسی چیز کا ذکر نہیں۔ ہم نے آپ کے حالات و کوائف سے متعلق اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ اردو، فارسی اور انگریزی کی عام کتابوں کے علاوہ مردم شماری کی ان رپورٹوں اور سرکاری گزیٹیروں سے بھی حاصل کیا گیا ہے جو تقسیم ہند سے قبل حکومت برطانیہ نے وقتًا فوقتًا مرتّب کرائے تھے اور جس کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے مردم شماری کی رپورٹیں مرتّب کی گئیں جو مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ ان سرکاری دستاویزوں، رپورٹوں اور گزیٹیروں کی تلاش و جستجو اور پھر ان کے مطالعہ

میں جس محنت شاقہ اور جانفشانی سے کام لیا گیا ہے وہ یا تو ہم جانتے ہیں یا پھر وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے تحقیقی کاموں سے سابقہ پڑا ہو۔

ہمارے ملک میں علماء اور صوفیاء کے حالات و کوائف مرتب کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سے اہلِ نظر خوب واقف ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے الفرقان کے ولی نمبر میں خوب لکھا ہے (۱) کہ علمائے اسلام کے جو تذکرے یہاں تیار ہوئے ہیں ان میں بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، "البحر العلام البحر القمقام" جیسے ہم قافیہ الفاظ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سوانح حیات کے متعلق تو ایک سطر بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح اولیاء اور مشائخ کے جو تذکرے ہیں وہ بھی ان سے بہتر نہیں۔ بیسیوں بلکہ بسا اوقات سینکڑوں صفحے اُلٹتے جائیے، تب کام کی ایک سطر ملتی ہے۔ شمس العلماء شبلی نعمانی نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ چیونٹیوں کے منہ سے دانہ دانہ جمع کر کے خرمن تیار کرنا پڑتا ہے۔ قصہ نویسی اور خوش اعتقادی کم و بیش تمام صوفیانہ تذکروں پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے اندر اولیائے کرام کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے۔ اور نہ ان کے علمی اور تبلیغی کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت سخی سرور کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی معاملہ ہے۔ آپ کے متعلق افسانوی روایات کی تو کمی نہیں، لیکن حقائق کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ واقعات اس قدر متضاد اور متخالف ہیں کہ ایک کو صحیح مانتے ہیں تو دوسرا غلط ہو جاتا ہے۔ بہر کیف ہم نے واقعات کی کڑیاں جوڑنے اور حالات کے سلسلے ملانے میں مقدور بھر کوشش کی ہے کہ آپ کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ کر قارئین کی نظروں کے سامنے آ جائے۔ اس کتاب میں حضرت سخی سرور سے متعلق تمام ضروری مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اب کوئی ایسا ماخذ نہیں رہا جس کا ذکر اس کتاب میں نہ آیا ہو۔ مجھے اُمید بلکہ یقین ہے کہ آنے والے محققین جب حضرت سخی سرور کے متعلق کچھ جاننا چاہیں گے تو یہ کتاب ان کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکے گی اور وہ اسے اپنا راہنما بنا کر تحقیق و تدقیق کی نئی راہیں استوار کر سکیں گے۔

حضرت سخی سرور پاک و ہند کے بہت سے شہروں سے متعلق ہیں مثلاً پاکستان میں لاہور ملتان، ڈیرہ غازیخان، دھونکل، گوجرانوالہ، ایمن آباد، سوہدرہ، پشاور وغیرہ اور ہندوستان

امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، ہوشیارپور اور یوپی کے بعض علاقے وغیرہ۔ چنانچہ ہمیں ان تمام اضلاع کے سرکاری گزیٹیروں کو ڈھونڈ کر بڑی تندہی سے ان کا مطالعہ کرنا پڑا اور ان سے آپ کے متعلق جو نئی معلومات حاصل ہوئیں ان کو کتاب ہذا میں موزوں اور مناسب مقام پہ درج کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بعض شہروں میں خود جا کر معلومات حاصل کیں اور بعض جگہوں سے دوستوں کے ذریعے مفید اور صحیح اطلاعات منگوائیں۔ ان کا تنقیدی مطالعہ کر کے ضروری امور کو کتاب میں شامل کر لیا گیا اور غیر ضروری چیزوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔

جہاں تک ڈیرہ غازیخاں کا تعلق ہے۔ مجھے اس بات کا شرف حاصل ہے کہ میں نے حضرت سخی سرور کے مزار کے قرب وجوار میں کم وبیش ڈھائی سال کا عرصہ گزارا۔ گو اس اثنا میں گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں سے وابستگی رہی؛ تاہم ڈیرہ غازی خاں میں مقیم ہونے کی وجہ سے مجھے آپ کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور آپ کی ولایت کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ کتاب کی تالیف کے مختلف اسباب میں سے ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے۔

آخر میں محکمۂ اوقاف کا شکر گزار ہوں جس نے حضرت سخی سرور کی اہمیت کے پیش نظر مجھے آپ کے متعلق ایک جامع کتاب لکھنے پر مامور کیا۔ میں نے بھی اس کام کی بجا آوری میں پوری دیانتداری اور لگن سے کام لیا ہے۔ میری یہ کوشش اب کتابی شکل اختیار کر کے قارئین کے سامنے ہے۔ میں اس سلسلے میں ان تمام احباب اور معاونین کا ممنون ہوں جن کی مخلصانہ اعانت سے مجھے یہ کتاب پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

پروفیسر حامد خاں حامد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

اسلامی تصوّف

تحقیق و تاریخ کی روشنی میں

تصوّف ایک وسیع موضوع ہے۔ اس پر مختلف زبانوں بالخصوص عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ قابلِ قدر ہے۔ ان کتابوں کے بلاواسطہ اور بالواسطہ مطالعہ سے جو اہم نتائج اخذ ہوتے ہیں انھیں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف) تصوّف کی لفظی تحقیق

(ب) تصوّف کی تعریف

(ج) تصوّف کی اصل

(د) تصوّف کے مختلف ادوار

یہ عنوانات اگرچہ تصوّف کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی تو نہیں کرتے تاہم ان کی مدد سے قارئین تصوف کی ماہیت اور حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

(الف) تصوف کی لفظی تحقیق

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین اپنے تحقیقی مقالے "اسلامی تصوف اور اقبال" میں لکھتے ہیں[1]: کہ لفظ تصوف کے اشتقاق کے متعلق ابتدا سے ان محققین کے درمیان جنھوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے، بہت اختلاف رہا ہے۔ اس اختلاف میں مشرقی اور مغربی دونوں محققین شریک ہیں۔ چنانچہ ذیل کی بحث سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکے گا۔

---

[1] اسلامی تصوف و اقبال ص ۳

علامہ لطفی جمعہ اپنی کتاب تاریخ فلاسفۃ الاسلام میں بیان کرتے ہیں[1] کہ کلمہ صوفی تھیوسوفیا سے مشتق ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی حکمتِ الٰہی کے ہیں۔ اس اشتقاق کی رو سے صوفی سے مراد وہ حکیم ہے جو حکمتِ الٰہی کا طالب ہو اور ہمیشہ اس کے حصول میں کوشاں رہے۔ علامہ موصوف اپنی رائے کی تائید میں کہتے ہیں کہ جب تک یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں نہیں ہوا اور فلسفہ کا لفظ اس زبان میں داخل نہیں ہوا، صوفیائے کرام نے اس علم یعنی تصوف کا اظہار نہیں کیا اور نہ خود کو اس علم کے اوصاف سے متصف کیا۔

ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الہند میں لکھتے ہیں[2] کہ تصوف کا لفظ اصل میں سین سے تھا اور اس کا مادہ س۔ و۔ ف یعنی سوف تھا جو یونانی زبان میں حکمت کے معنی میں آتا ہے۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چونکہ صوفیا میں اشراقی حکما کا انداز پایا جاتا ہے اس لیے لوگوں نے ان کو سوفی یعنی حکیم کہنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس لفظ کی صورت بدل کر صوفی ہو گئی۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۳ء) اپنی کتاب کشف المحجوب میں رقمطراز ہیں[3] کہ لوگوں نے اسم صوفی کی تحقیق میں بہت سے اقوال بیان کئے ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اہلِ تصوف کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صوف کا لباس پہنتا ہے۔ دوسرے گروہ کے خیال میں اس کو صوفی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ برگزیدگی میں صفِ اول میں ہوتا ہے۔ تیسرے کی رائے میں اس کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اصحابِ صفہ[4] سے محبت کرتا ہے۔ چوتھے کا نظریہ یہ ہے کہ لفظ صوفی صفا

---

[1] قرآن و تصوف ص ۹۔ بحوالہ تاریخ فلاسفۃ الاسلام۔

[2] الغزالی ص ۲۷۷ بحوالہ کتاب الہند۔

[3] کشف المحجوب ص ۱۱، ۳۶۔۳۷ [4] ایضاً ص ۳۔۴

سے مشتق ہے۔ آگے چل کر ہجویری لکھتے ہیں کہ صفائی سب امور میں محمود ہے اور اس کی ضد کدورت ہے۔ چونکہ اہلِ تصوف نے اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب بنالیا ہے، اور طبیعت کی کدورتوں سے پاک و صاف ہو گئے ہیں اس لئے ان کو صوفی کہا جاتا ہے۔

اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ہجویریؒ کے خیال میں تصوف صفا سے مشتق ہے اور تصوف کا عامل یعنی صوفی وہ ہے جس نے مسلسل مجاہدات اور پیہم ریاضیات کے ذریعے قلب کی صفائی کر لی ہو۔ لہٰذا صفائے قلب ہی حقیقت میں وہ شے ہے جس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کے جملہ اعمال کا دارومدار صفائے قلب ہی پہ ہے[1] چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ (ترجمہ) بلاشک جسم کے اندر ایک ایسا ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو (رہتا ہے) تو تمام جسم درست ہے اور جب وہ فاسد ہو تو سارا جسم فاسد ہے۔ یاد رکھو وہ قلب ہے[2] معنوی اعتبار سے اگرچہ حضرت ہجویریؒ کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن لسانی اعتبار سے صحیح نہیں کیونکہ صفا سے جو لفظ مشتق ہو گا وہ صوفی نہیں بلکہ صافی ہو گا۔ پس یہ رائے کہ تصوف صفا سے مشتق ہے، محل نظر ہے۔[3]

بعض محققین کا خیال ہے کہ تصوف صف سے مشتق ہے[4] کیونکہ اہل تصوف کو بارگاہِ ایزدی میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور وہ خدا کے حضور صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں یعنی کے اعتبار سے خواہ یہ رائے درست ہو لیکن لغت کے لحاظ سے یہ بھی درست نہیں کیونکہ صاحبِ تصوف کو اگر صف کی طرف نسبت ہو گی تو وہ

---

[1] قرآن و تصوّف ص ۸

[2] الا وان فی الجسد مضغۃ۔ اذا صلحت صلح الجسد کلہ۔ واذا فسدت فسد الجسد کلہ۔ الا وھی القلب (اسلامی تصوف و اقبال ص ۵ بحوالہ بخاری شریف ج ۱ ص ۱۳)۔

[3] قرآن و تصوف، ص ۸

[4] اسلامی تصوف و اقبال ص ۸

صفی ہوگا صوفی نہیں۔

بعض محققین کی تحقیق یہ ہے کہ تصوف کا حامل یعنی صوفی صفہ[1] سے نسبت رکھتا ہے[2]۔ اگرچہ صوفیانہ زندگی کا اولین نمونہ ان بندگانِ خدا میں ملتا ہے لیکن لفظ تصوف کی نسبت ان کی طرف درست نہیں۔ کیونکہ اگر یہ نسبت درست ہوتی تو صاحبِ تصوف کو صفی ہونا چاہیئے تھا نہ کہ صوفی[3]۔

ابونصر عبداللہ علی السراج الطوسی (متوفی ۳۷۸ھ مطابق ۹۸۸ء) کتاب اللمع میں لکھتے ہیں کہ[4]: لفظ صوفی کی نسبت صوف سے ہے جو انبیاء، اولیا اور اصفیاء کا لباس تھا بہت

---

[1] اہلِ صفہ وہ لوگ ہیں جو آنحضرتؐ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے پیش دالان (عربی صفہ) میں مقیم تھے اور شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج چہارم ص ۱۸ ۴) اہلِ صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں تیس سے ستر تک بتائی گئی ہے۔ یہ لوگ غربت کی زندگی بسر کرتے اور صرف ایک ہی کپڑے میں ملبوس رہتے تھے جو گھٹنوں تک ہوتا تھا۔ ان کو دو کپڑے کبھی میسر نہیں ہوئے۔ کھانے پینے کا انتظام اگرچہ بیت المال کی طرف سے تھا لیکن اس ابتدائی زمانے میں بیت المال کی حیثیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ کافی نہ تھا اس لیے ان کو غذا کی کمی کے سلسلے میں صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا تھا۔ بایں ہمہ وہ اس حالت پر راضی تھے اور انھوں نے مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ کو اپنا اصولِ حیات بنالیا تھا۔ ان کے متعلق قرآن پاک میں آیا ہے: ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجہہ (ترجمہ: اور ان لوگوں کو مت نکالو جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ زہد و تقویٰ ان کا خاص عمل تھا اور وہ متاع دنیا سے بے نیاز ہو کر صرف ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ (اسلامی تصوف و اقبال ص ۶ و ۷۱-۷۳)

[2] تاریخ تصوف در اسلام ص ۳۸۔ [3] قرآن و تصوف ص ۸-۹۔

[4] اقبال مجلہ بزمِ اقبال لاہور، بابت اپریل ۱۹۵۷، ص ۸۷ بحوالہ کتاب اللمع۔ مضمون: تاریخ تصوف کا ہندی یونانی اور اسلامی پس منظر۔ از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ نیز ملاحظہ ہو اسلامی تصوف و اقبال۔ ص ۷

سی احادیث میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے صوف یعنی اُون کے کپڑے پہنے[1] اور آپؐ کا انتقال اُونی کپڑے میں ہوا[2] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰؑ سے خطاب فرمایا[3] تو وہ ازسر تا پا اونی لباس پہنے ہوئے تھے[4] حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو حواری کہتے ہیں جس کے معنی سفید لباس والے کے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں اگرچہ لفظ صوفی نظر نہیں آتا۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت صحابی سے بڑھ کر اور کوئی لفظ معزز نہ تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اہلِ بغداد نے سب سے پہلے یہ لفظ اختیار کیا۔ حسن بصریؒ اور سفیان الثوریؒ کے عہد میں بھی یہ لفظ رائج تھا اور تاریخ مکہ میں محمد بن اسحاق اور دوسرے لوگوں کی سند سے روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

علامہ ابن جوزی کا خیال ہے کہ لفظ صوفی صوفۃ[5] سے نکلا ہے[6] یہ خیال اگر کسی حد تک قرینِ قیاس بھی ہو تو اس امر کا کوئی ثبوت قطعی طور پر بہم نہیں پہنچایا جا سکتا کہ صوفی کا لفظ اپنے مروجہ معنی میں صوفۃ ہی سے نکلا ہے۔ کیونکہ یہ تو ایک خاص قبیلے کا نام تھا اور اس قبیلے تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ اس لفظ کا عرب کے حدود سے نکل کر بیرونی ممالک میں اس قدر مقبول اور مشہور ہونا حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

ھ[1] سلامی تصوف و اقبال ص ۷ بحوالہ بخاری، لباس، ص ۱۔

ھ[2] ایضاً بحوالہ ترمذی، لباس، ص ۱۰

ھ[3] من اختارہ الحق فصافاہ ..... وصُوفِیِ، علیٰ زنۃ عوفی ای عافاہ ربہ فعوفی (اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ج ۴، ص ۴۲۸)

ھ[4] ترمذی محل مذکور

ھ[5] بنو صوفۃ ایک بدوی قبیلہ کا نام ہے جو ایام جاہلیت میں خانہ کعبہ کی خدمت کرتا تھا اور حج کے زمانے میں حاجیوں کی رہبری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۴۔ ص ۴۱۸۔ اسلامی تصوف و اقبال ص ۸)

ھ[6] اسلامی تصوف و اقبال ص ۸ بحوالہ تلبیس ابلیس از علامہ ابن جوزی۔

علامہ ابنِ تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء) اپنے رسالہ صوفیاء و فقراء میں مختلف اقوال کو رد کرنے کے بعد لکھتے ہیں[1] کہ قولِ معروف وہ ہے کہ تصوف کی نسبت صوف سے ہے۔ ابنِ خلدون (متوفی ۸۰۷ھ مطابق ۱۴۰۶ء) کا بھی یہی قیاس ہے۔ عربی لغت کی رُو سے تصوف کے معنی ہیں اس نے لباس صوف پہنا۔ جیسے تقمص کے معنی ہیں اس نے قمیص پہنی۔ ابتدا میں لوگ صوفیہ کو صوف پوشی کی بنا پر صوفی کہنے لگے[2]

مغربی محققین میں سے جنھوں نے تصوف پر خاص تحقیقات کی ہیں۔ نولڈیکی (متوفی ۱۹۳۰ء) اور پروفیسر نکلسن (متوفی ۱۹۴۵ء) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر کی رائے میں صاحب تصوّف یعنی صوفی صوف سے ماخوذ ہے اور یہ نام ان صوفیہ کو دیا گیا ہے جنھوں نے عیسائی راہبوں کے تتبع سے ترک دنیا کے بعد صوف یعنی پشم کا لباس اختیار کیا[3] پروفیسر نکلسن بھی نولڈیکی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں[4]: کہ لفظ تصوف صوف سے مشتق ہے۔

دائرہ معارف اسلامیہ میں تصوف پہ دو پُر مغز تحقیقی مقالے شامل ہیں۔ ایک میں تصوف کے اشتقاق کے ذیل میں لکھا ہے[5] کہ تصوف مادّہ صوف سے باب تفعل کا مصدر ہے اور اُونی لباس عادۃً پہن لینے کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اصطلاح کے مطابق صوفی بن کر خود کو متصوفانہ زندگی کے لیے وقف کر دینے کو تصوف کے نام سے تعبیر کریں گے۔ لفظ صوفی کے لیے اس کے علاوہ جتنے قدیم و جدید اشتقاقات پیش کئے جاتے ہیں ان سب کو رد کیا جاسکتا ہے مثلاً یہ کہ صوفیہ منسوب بہ اہل الصفہ ہیں یا منسوب بہ صفِ اول یا بہ بنوصوفہ یا بہ صوفانہ[6] یا بہ صفوۃ القفا[7] یا بہ صُوفِیَ[8] یا منسوب بہ کلمہ یونانی

---

[1] تاریخ تصوف در اسلام ص ۴۴ بحوالہ صوفیاء و فقراء

[2] قرآن و تصوف ص ۷

[3] MYSTICS OF ISLAM, P 2

[4] ایضاً

[5] اردو دائرہ معارف اسلامیہ - ج ۴، ص ۴۱۹-۴۱۸-

[6] ایک قسم کی ترکاری۔

[7] گدی کے بالوں کا گچھا۔

[8] مادہ صفا کے باب مفاعلۃ کا ماضی مجہول بمعنی صاف کیا گیا۔ صَافیٰ سے صُوفِیَ بروزن قُوبِلَ مجہول قابَلَ۔ بہت ابتدائی زمانے تقریباً آٹھویں صدی عیسوی سے یہ ماضی مجہول لفظ صوفی (زاہد پشمینہ پوش) کے ساتھ بطور توریہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ (دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۴، ص ۴۱۸، ۴۱۹-

سوفوس[۱]۔ نولڈیکی نے آخری اشتقاق کی تردید اس بنا پر کی ہے کہ یونانی حرف SIGMA عربی میں سین کی صورت میں آتا ہے نہ کہ ص کی شکل میں۔ پھر یہ کہ آرامی زبان میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جسے سوفوس اور صوفی کی درمیانی صورت سمجھا جا سکے۔

دوسرے مقالے میں تحریر ہے[۲]: کہ تصوف مادہ ص۔ و۔ ف کے باب تفعل سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لئے وقف کرنا۔۔۔۔ لفظ صوفی بہر کیف لغوی اعتبار سے صوف (اون یا پشم) کا اسم منسوب ہے۔ اور یہ امر قریب بیقینی ہے کہ صوفی کی اصطلاح کبھی عام نہ ہوتی اگر ص۔ و۔ ف کا مادہ صوتی ولالتوں سے مالا مال نہ ہوتا یا علم الحروف کے مطابق، جس کے صوفی بہت ماہر تھے، ان حروف صامتہ کی عددی قدر، یعنی مادہ ص۔ و۔ ف سے اس لفظ کی سرّی مشابہت نہ ہوتی؟ جس سے بے شمار ایسے الفاظ مشتق ہیں جو تصوف کے بعض بنیادی پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں مثلاً اصفا (پاکیزگی)، صفو (برگزیدہ لوگ)، صفی (خالص دوست)، مصطفیٰ وغیرہ۔۔۔۔۔ اس لفظ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی صوتی مناسبت اہل الصفّہ سے ہے۔

ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی نے تصوف پر ان تمام محققین کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لے کر، جو ان سے پہلے گزر چکے تھے۔ اپنی کتاب تاریخِ تصوف در اسلام میں لکھا ہے[۳]: کہ تصوف کی اصل کے متعلق تمام اقوال میں سے لغت، عقل اور منطق کی رُو سے یہ قول صحیح ہے کہ تصوف عربی زبان کا لفظ ہے اور صوف سے مشتق ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچتی ہے کہ تصوف صوف سے نکلا ہے اور چونکہ باب تفعل کے وزن پر آیا ہے اس لئے صوف کا لباس پہننے کے فعل کو تصوف کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ تصوف، صوفی اور صوف میں کیا مناسبت ہے۔

---

[۱] SOPHOS، کوشش یہ بھی کی گئی ہے کہ تصوف کو تھیوسوفیا THEOSOPHIA سے مشتق ثابت کیا جائے (دیکھیں کتاب بذا ص ۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۴، ص ۴۲۸، ۴۲۹۔

[۲] تاریخ تصوف در اسلام ص ۴۵

اس کا جواب یہ ہے کہ صوف کا لباس فقر کی علامت اور دنیا و ما فیہا سے بے نیازی کی نشانی ہے۔ مختلف روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اور صحابہؓ کرام بھی بعض اوقات صوف کا لباس پہنتے تھے جس سے ان کا مقصد فقر اور بے نیازی کا اظہار تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے[1] کہ تم صوف کا لباس اختیار کرو۔ اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے۔ ایک اور حدیث میں مذکور ہے[2] کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔

اس عہد کے دیگر اکابر نے بھی سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے صوف کا لباس پہنا ہے۔ چنانچہ حسن بصریؒ نے فرمایا ہے[3] کہ میں نے ان ستر اصحاب کو جو جنگِ بدر میں شریک تھے، صوف کے کپڑے پہنے ہوتے دیکھا۔ اور حضرت ابو بکرؓ بھی صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔ اُویس قرنی (متوفی ۳۷ھ مطابق ۶۵۷ء) کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ صوف کا لباس پہنتے تھے[4]۔

اس لحاظ سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تصوف اگرچہ صوف سے نسبت رکھتا ہے لیکن تصوف اور صوفی کی اصطلاحات زمانۂ ما بعد میں وجود میں آئی ہیں[5]۔

پہلا صوفی کون تھا؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے صوفی کا اطلاق کس پر کب اور کہاں ہوا؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابو سعید نور الدین اپنے مقالے "اسلامی تصوف اور اقبال" میں مصارع العشاق کے حوالے سے لکھتے ہیں[6] کہ لفظ صوفی کا رواج پہلی صدی ہجری مطابق ساتویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ امیر معاویہ نے جن کا دورِ خلافت ۴۱ھ تا ۶۰ھ مطابق ۶۶۱ تا ۶۸۰ء

۱ھ علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم (کشف المحجوب ص ۳۲)

۲ھ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبس الصوف (کشف المحجوب ص ۳۲)

۳ھ کشف المحجوب ص ۳۲ ۴ھ ایضاً

۵ھ اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۱

۶ھ اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۰ بحوالہ مصارع العشاق، ص ۲۲۴

ہے۔ اپنے ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے :

قد کنت تشبہ صوفیا لہ کتب ۔۔۔ من الفرائض او آیات فرقان [۱]

(ترجمہ) حالانکہ تو ایسے صوفی سے مشابہت رکھتا تھا جو فرائض اور احکامِ دین کی کتابوں کا مالک ہے۔

امام قشیری (متوفی ۴۶۵ھ، مطابق ۱۰۷۳ء) کی تحقیق یہ ہے [۲] کہ لفظِ صوفی ۲۰۰ھ مطابق ۸۰۰ء سے کچھ پہلے مشہور ہوا۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد اس زمانے کے افاضل جس لقب سے یاد کئے جاتے تھے، وہ صحابہ تھا۔ کسی دوسرے لقب کی انھیں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ صحابیت سے بہتر کوئی فضیلت نہ تھی۔ جن بزرگوں نے صحابہ کی صحبت اختیار کی تھی وہ اپنے زمانہ میں تابعین کہلاتے اور تابعین کے فیض یافتہ حضرات اپنے دور میں تبع تابعین کے ممتاز لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد زمانے کا رنگ بدلا اور لوگوں کے احوال و مراتب میں نمایاں فرق پیدا ہونے لگا۔ جن خوش بختوں کی توجہ دینی امور کی جانب زیادہ تھی ان کو زہّاد اور عباد کے ناموں سے یاد کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بدعات کا ظہور ہونے لگا اور ہر فریق نے اپنے زہد کا دعویٰ شروع کیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کر خواص اہلسنت نے ابنائے زمانہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان ہی کو صوفی کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

---

[۱] واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ بنی عذرۃ کا ایک جوان ایک دن امیر معاویہ کے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا کہ آپ کے عامل ابن ام الحکیم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مَیں نے اپنی چچا زاد سے شادی کی تھی۔ کسی بات پر بیوی سے اختلاف ہوگیا۔ میں آپ کے عامل کے پاس گیا اور شکایت کی۔ اس نے صلح صفائی کرانے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ میری بیوی حسین ہے، تو اس کے ماں باپ کو مال و دولت کا لالچ دلا کر خود ہی اس سے شادی کر لی۔ امیر معاویہ اس واقعہ کو سن کر بہت غصّے ہوئے اور فوراً اس عامل کے نام ایک عتاب نامہ لکھ بھیجا جس کے آخر میں تین چار شعر بھی درج تھے۔ مذکورہ بالا شعر بھی ان میں شامل تھا۔

[۲] قرآن اور تصوف ص ۱۰۹۔

پروفیسر ماسینیوں[1] دائرۂ معارف الاسلامیہ میں لفظ تصوف کی تحقیق کے ماتحت لکھتے ہیں[2] کہ الصّوفی کو لقب کے طور پر تاریخ میں پہلے پہل دوسری صدی ہجری مطابق آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کوفہ کے ایک شیعہ کیمیا گر جابر بن حیان کے نام کے ساتھ جو زہد میں ایک خاص مسلک رکھتا تھا، استعمال کیا گیا۔ نیز ایک نامور صوفی ابوہاشم کوفی کے نام کے ساتھ یہ لفظ دکھائی دیا۔ اس لفظ کا صیغہ یعنی جمع صوفیہ پہلی دفعہ ۱۹۹ھ مطابق ۸۱۴ء میں اسکندریہ کی ایک معمولی سی شورش کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔ محاسبی اور جاحظ کے قول کے مطابق تقریباً اسی زمانے میں اس کا استعمال نیم شیعی مسلمانوں کی ایک جماعت صوفیہ کے لئے ہوا تھا، جو کوفہ میں پیدا ہوئی اور جس کا آخری امام عَبدک الصوفی[3] تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں لفظ صوفی کوفہ تک محدود تھا۔

دائرۂ معارف اسلامیہ میں ایک اور جگہ لکھا ہے[4] کہ سب سے پہلے صوفی کا اطلاق ابوہاشم بن شریک (حدود ۱۳۰ھ) اور جابر بن حیان، ماہر علم کیمیا (حدود ۱۶۰ھ) پر کیا گیا۔ یہ دونوں کوفی تھے لیکن ممکن ہے کہ یہ لفظ اس سے قبل بھی استعمال کیا گیا ہو[5]۔ اور گو موجودہ تحریروں میں شاذ طور پر مستعمل ہوا، پھر بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا استعمال جتنا تحریروں سے ثابت ہے، اس سے بہت زیادہ عام ہو۔ بہر حال چوتھی صدی ہجری میں یہ اصطلاح عام طور پر مروج تھی۔

ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی نے اپنی کتاب تاریخ تصوف در اسلام میں تحریر کیا ہے[6] کہ

ف۱ MASSIGNOW

ف۲ دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۴، ص ۴۱۹

ف۳ یہ شخص نبات خور، تارک اللحم اور خلافت میں حق ارث کا قائل تھا۔ تقریباً ۲۱۰ھ مطابق ۸۲۵ء میں بغداد میں فوت ہوا (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۴، ص ۴۱۹)

ف۴ دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۴، ص ۴۹۹ ف۵ ایضاً ص ۹

ف۶ تاریخ تصوف در اسلام، ص ۴۲

سب سے پہلے عبدک صوفی (متوفی ۲۱۰ھ مطابق ۸۲۵ء) صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ تحقیق صحیح ہے کہ لفظ صوفی ابو ہاشم کوفی (متوفی ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء) سے رائج ہوا۔ بے شک وہی اولین بزرگ ہیں جو صوفی کے لقب سے پکارے گئے۔ اسلامی تصوف کی تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ابو ہاشم صوفی سے پہلے کوئی ایسے بزرگ نہ تھے جو صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے ہوں۔ اس امر کی تصدیق مولانا جامی (متوفی ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۳ء) کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنی کتاب نفحات الانس میں لکھتے ہیں [1] کہ ابو ہاشم صوفی [2] سے پہلے بھی بہت سے بزرگانِ دین تھے جو زہد و ورع، توکل، محبت اور دوسرے دینی معاملات میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے، لیکن پہلے شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے وہی تھے۔ ان سے قبل اور کوئی شخص اس نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ ابو ہاشم صوفی، سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ مطابق ۷۷۸ء) ہم عصر تھے۔ سفیان ثوری کے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں دقایقِ ریا سے آگاہ نہ ہوتا۔ [3] اور ابو ہاشم کو دیکھنے سے قبل میں نہیں جانتا تھا کہ صوفی کیا ہے [4]

صوفیہ کی اولین خانقاہ

اس ضمن میں ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی رقم طراز ہیں [5] کہ آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد

---

[1] نفحات الانس ص ۳۱

[2] ابو ہاشم صوفی کوفہ کے رہنے والے تھے لیکن بعد شام میں جا کر آباد ہو گئے اور وہیں ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء میں انتقال فرمایا۔ (نفحات الانس ص ۳۱)

[3] لولا ابو هاشم الصوفی ما عرفت دقایق الریاء (اسلامی تصوف اقبال ص ۸۸ بحوالہ نفحات الانس ص ۳۱)

[4] اسلامی تصوف اور اقبال ۸۸ بحوالہ نفحات الانس ص ۳۱۔

[5] تاریخ تصوف در اسلام ص ۱۹۔

میں جہاں مسلمانوں کے لئے دینی فرائض کی انجام دہی کا مقام مسجد تھا وہاں روزمرّہ زندگی کے دوسرے مسائل کے طے پانے کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر نہ تھیں لیکن کچھ عرصہ بعد جب صوفیہ کا گروہ عام مسلمانوں سے الگ ہوگیا تو ان کی روحانی تعلیم اور تربیت کے لئے ایک جداگانہ مقام کی ضرورت پیش آئی۔ خانقاہ کا وجود اصل میں اسی ضرورت کا نتیجہ تھا۔ اور یہ دوسری صدی ہجری مطابق آٹھویں صدی عیسوی کے نصف میں وجود میں آئی۔ ابوہاشم صوفی نے صوفیہ کی تعلیم و تربیت، مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و فکر کی غرض سے شام کے مقام رملہ میں عیسائی راہبوں کے صومعہ کی طرز پر ایک خانقاہ تعمیر کی۔ اسلامی تصوف کی تاریخ میں اولین خانقاہ یہی تھی اور اس کا بانی ابوہاشم صوفی تھا۔

(ب) تصوّف کی تعریف

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے تصوف کی تعریف کے ذیل میں بڑی معنی خیز بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] کہ تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف محض ایک ذاتی، تجرباتی، ذوقی اور وجدانی شے ہے۔ چنانچہ تمام اصحاب رائے کا ایک ہی بات پر متفق ہونا محال ہے۔ ہر ایک کا ذوق اور وجدان دوسرے سے مختلف ہے۔ جس کا ذوق جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ حقیقت الامر کو سمجھ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مسلکِ تصوف نے کسی زمانے میں بھی کوئی واحد اور مستقل صورت اختیار نہیں کی۔ ہر دور میں اس کی شکل بدلتی رہی ہے۔ اوائل اسلام میں تصوف محض زہد و تقویٰ کی صورت میں موجود تھا۔ زمانۂ مابعد میں اس کے اندر مختلف رنگوں کی آمیزش ہوتی رہی۔ چنانچہ اس کی کوئی جامع تعریف ممکن نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس ضمن میں لکھتے ہیں[2] کہ زندگی کے تمام اساسی حقائق

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال ص ۱۲

[2] اردو۔ اقبال نمبر ۱۹۳۸ء ص ۷۸۴۔

کی طرح تصوف کی تعریف و تحدید بھی نہایت مشکل ہے۔ فقط اسلامی تصوف میں سینکڑوں مختلف تعریفیں اس کی ملتی ہیں اور بعض تعریفیں تو باہم اس قدر متخالف ہیں کہ ان میں سے کسی قدر مشترک کو اخذ کرنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

بہرکیف صوفیائے کرام نے اپنے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق تصوف کی جو تعریفیں کی ہیں، ان میں سے چند اہم تعریفیں، زمانی ترتیب کے لحاظ سے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قارئین کو تصوف کے صحیح مفہوم کا علم ہو سکے گا۔

۱۔ معروف کرخی (متوفی ۲۰۰ھ مطابق ۸۱۶ء) کہتے ہیں[۱] کہ حقائق کو گرفت میں لانا، دقائق پر گفتگو کرنا اور خلائق کے پاس جو کچھ ہے، اس سے ناامید ہونا تصوف ہے۔

۲۔ ذوالنون مصری (متوفی ۲۴۵ھ مطابق ۸۵۹ء) سے سوال کیا گیا کہ صوفی کون ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا کہ صوفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام کائنات میں سے صرف اللہ تعالیٰ کو پسند کیا۔[۲]

۳۔ سہیل بن عبداللہ تستری (متوفی ۲۸۳ھ مطابق ۸۹۶ء) کا کہنا ہے کہ (الف) صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے خالی اور تفکر سے پُر ہو۔ اور قرب خدائے عزوجل میں بشر سے منقطع ہوا اور اس کی آنکھوں میں خاک اور سونا برابر ہو۔[۳] (ب) تصوف کے معنی ہیں کم کھانا، خدا سے قربت حاصل کرنا اور مخلوقات سے بھاگنا۔[۴]

۴۔ ابوالحسن نوری (متوفی ۲۹۵ھ مطابق ۹۰۸ء) کا بیان ہے کہ (الف) صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روح بشریت کی کدورت سے آزاد، آفتِ نفس سے صاف اور ہوا و ہوس سے پاک ہو گئی ہو۔ یہ لوگ صف اول اور درجہ اعلیٰ میں خداوند کریم سے قرب حاصل کئے ہوئے ہیں۔[۵] (ب) وہ غیر اللہ سے بھاگتے ہیں اور نہ کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں اور نہ مملوک۔[۶]

۱؎ تذکرۃ الاولیا، ص ۱۷۴
۲؎ ایضاً، ص ۸۵
۳؎ ایضاً، ص ۱۶۹
۴؎ ایضاً، ص ۱۶۹
۵؎ ایضاً، ص ۲۵۸
۶؎ ایضاً، ص ۲۵۸

(ج) صوفی وہ ہے جس کے فکر میں کوئی چیز نہ آئے اور نہ وہ کسی شے کی فکر میں ہو کیونکہ تصوف نہ علوم کا نام ہے اور نہ رسوم کا بلکہ اخلاق کا نام ہے۔ اگر یہ علم ہوتا تو تعلیم سے اور اگر رسم ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہوجاتا۔[1] (د) تصوف دنیا کی دشمنی اور مولیٰ کی دوستی کا نام ہے۔[2]

۵۔ جنید بغدادی (متوفی ۲۹۷ھ مطابق ۹۱۰ء) سے مروی ہے کہ (الف) عارف وہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اسرارِ نہانی سے گفتگو کرتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے۔[3] (ب) معرفت خدائے تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہنے کا نام ہے۔[4] (ج) صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمانِ الٰہی کو ماننے والا ہو۔ اس میں تسلیم حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح، اندوہ حضرت داؤدؑ کی طرح، فقر حضرت عیسیٰؑ کی طرح، صبر حضرت ایوبؑ کی طرح، شوق حضرت موسیٰؑ کی طرح اور اخلاق جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہو۔[5] (د) تصوف ایک ایسی نعمت ہے جس میں بندہ قائم ہے۔[6] (ہ) تصوف یہ ہے کہ بغیر علائق کے خدا سے قرب حاصل ہو۔[7] باطن تصوف کے متعلق جنید بغدادی سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم اس کا ظاہر ہی لئے رہو، باطن کی بابت کچھ نہ پوچھو کیونکہ صوفی وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور وہی جانتا ہے۔[8]

۶۔ ابوبکر شبلی (متوفی ۳۳۴ھ مطابق ۹۴۶ء) سے تصوف کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواباً کہا کہ (الف) تصوف شرک ہے، کیونکہ تصوف کے معنی دل کو خیالِ غیر سے محفوظ رکھنا ہے۔ حالانکہ غیر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔[9] (ب) صوفی وہ ہے

---

[1] تذکرۃ الاولیا، ص ۲۵۹
[2] ایضاً، ۲۰۹
[3] تاریخ تصوف در اسلام، ص ۱۹۸
[4] ایضاً، ص ۱۹۹
[5] تذکرۃ الاولیا، ص ۲۳۹
[6] ایضاً، ۲۳۹
[7] ایضاً
[8] ایضاً، ۲۳۹
[9] ایضاً، ص ۳۸۶

جو خلق سے منقطع اور حق سے متصل ہو۔[1] (ج) صوفی کو اس زمانے کی طرح رہنا چاہئے، جبکہ وہ وجود میں نہیں آیا تھا۔[2]

۷۔ ابوالحسن علی ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۳ء) بیان کرتے ہیں کہ[3] صوفی کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب کر لیتا ہے اور طبیعت کی آلائش سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور حقیقت میں صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے پاک اور صاف ہو۔ کیونکہ تصوف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ تکلف ہے یعنی صوفی اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہے اور یہی تصوف کے اصلی معنی ہیں۔ اہلِ تصوف کی تین قسمیں ہیں۔ (الف) صوفی جو اپنی ذات کو فنا کر کے خدا کی ذات میں بقا حاصل کرتا ہے اور اپنی طبیعت سے آزاد ہو کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (ب) متصوف جو صوفی کے درجہ کو مجاہدہ سے تلاش کرتا ہے اور تلاش میں اپنی ذات کی اصلاح کرتا ہے۔ (ج) مستصوف، جو محض مال و منال اور جاہ و حشمت کے لئے خود کو مثل صوفی کے بنا لیتا ہے۔ پس صوفی صاحبِ وصول (یعنی وصل و وصول کرنے والا)، متصوف، صاحبِ اصول (یعنی صوفی کے اصول پر چلنے والا) اور مستصوف، صاحبِ فضول (یعنی فضولیات کا طالب ہوتا ہے)۔

۸۔ ابو حفص عمر بن محمد سہروردی (متوفی ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء)، صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے[4] کہ تصوف ایک جامع اور مانع لفظ ہے، جو فقر اور زہد پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ زہد اور فقر کے علاوہ کچھ اور بھی اوصاف اور اضافات ہیں۔ جب تک وہ نہ پائے جائیں۔ صوفی صحیح معنوں میں صوفی کہلانے کا حقدار نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زاہد اور فقیر کیوں نہ ہو۔

۱؎ تذکرۃ الاولیا، ص ۳۸۶ ۲؎ ایضاً

۳؎ بزم صوفیا، ص ۱۴، ۱۵ بحوالہ کشف المحجوب۔

۴؎ تاریخ تصوف در اسلام، ص ۲۰۵۔

تصوف کی تعریف کے ضمن میں صوفیائے کرام کے صرف اہم اقوال اوپر درج کئے گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف میں تنوع پایا جاتا ہے[۱] اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا کیونکہ تصوف کی بنیاد ذاتی احساس، تجزیے اور تجربے پر ہے۔ تاہم صوفیائے کرام نے جو کچھ بیان کیا ہے اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لئے کافی ہے۔ صوفیہ کے اقوال سے یہ بھی استنباط ہوتا ہے کہ تصوف کی شکل ہر دور میں بدلتی رہی ہے اور اس میں گوناگوں رنگ آمیزیاں ہوتی رہی ہیں جس کی بنا پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کی طرف راہیں مخلوقات کی جانوں کے برابر ہیں[۲] جہاں تک تصوف کے مختلف ادوار کا تعلق ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

---

[۱] اس سلسلے میں مولانا رومی (متوفی ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء) نے اپنی مثنوی (جلد سوم) میں "اختلاف کردن در چگونگی و شکل پیل" کے عنوان سے ایک عمدہ مثال پیش کی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

پیل اندر خانۂ تاریک بود — عرضہ را آوردہ بودندش ہنود
از برائے دیدنش مردم بسے — اندران ظلمت ہمی شد ہر کسے
دیدنش با چشم چوں ممکن نبود — اندران تاریکیش کف می بسود
آن یکی را کف بخرطوم اوفتاد — گفت ہمچو ناو دانستش نہاد
آن یکی را دست برگوشش رسید — آن برا و چو بادبیزن شد پدید
آن یکی را کف چوں برپایش بسود — گفت شکل پیل دیدم چوں عمود
آن یکی بر پشتِ او بنہاد دست — گفت خود ایں پیل چون تختی بدست
ہمچنین ہر یک بجزوی کو رسید — فہم آن میکرد ہر آن می تنید
از نظرگہ گفت شان شد مختلف — آن یکی دالش لقب داد آن الف
در کف ہر کس اگر شمعی بدی — اختلاف از گفت شان بیرون شدی

(ملاحظہ ہو مثنوی مولانا روم دفتر سوم ص ۱۵۷ سطر ۱۴، ۱۸) یعنی جس کو جو کچھ محسوس ہوا اس نے اسی کو ہاتھی کا وصف قرار دے دیا۔ تصوف کے معاملے میں بھی بعینہٖ ایسا ہوا۔

[۲] الطرق الی اللہ بعدد انفس الخلائق (اسلامی تصوف اور اقبال ص ۱۸)

مختصر یہ ہے کہ تصوّف کی کوئی جامع تعریف بے حد مشکل ہے۔ اس بنا پر پروفیسر نکلسن یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ[1] اگرچہ عربی اور فارسی کی کتابوں میں تصوّف کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں اور وہ تاریخی لحاظ سے کافی دلچسپ بھی ہیں لیکن ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ تصوّف ناقابل تعریف ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ کوئی مبہم شے ہے بلکہ اس لئے کہ تصوف کا تعلق نظریات سے کم اور بدیہات سے زیادہ ہے اور ہر بدیہی شے کا ادراک سہل تر اور اس کی تعریف مشکل ترین ہوتی ہے۔ جیسے چاند کی چاندنی اور سورج کی گرمی محسوس تو ہو سکے گی لیکن اس کی جامع مانع تعریف نہ کی جا سکتی ہے نہ ہو سکتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے تا بخشش نرسی۔

بہرکیف اگر تصوف کے مطالب کو احادیثِ نبوی میں تلاش کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جو احکامِ الٰہی کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کر کے محسن بنتا ہے۔ وہی صوفی ہے اور اس کا یہ احسان تصوف ہے۔ احسان کی تعریف میں حدیث شریف میں مذکور ہے[2] کہ تو اللہ کی عبادت ایسی حالت میں کر کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو بے شک وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔

(ج) تصوّف کی اصل

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین اسلامی تصوف کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں[3] کہ تیسری صدی ہجری مطابق نویں صدی عیسوی کے آغاز سے تصوف نے علمی اعتبار سے کوئی باقاعدہ شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اوائلِ اسلام میں تصوف زیادہ تر زہد اور تقویٰ کی صورت

---

[1] MYSTICS OF ISLAM, P 13

[2] ان تعبد اللہ کانک تراہ، فان لم تکن تراہ فانہ یراک (ملاحظہ ہو اسلامی تصوف اور اقبال ص ۱۸ بحوالہ بخاری جلد ا، ص ۱۲)

[3] اسلامی تصوف اور اقبال ص ۱۹۔

میں موجود تھا۔ اور اس عہد کے زاہد اور متقی لوگوں کو صوفی کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ زہد و تقویٰ کی شکل بدلتی گئی اور ایک ایسے نظریہ کی پیدائش عمل میں آئی جو بظاہر مستقل معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کا ایک نیا نام تصوف بھی وجود میں آچکا تھا لیکن اس کی کوئی جامع تعریف نہیں ہوسکتی تھی۔ تیسری صدی ہجری مطابق نویں صدی عیسوی میں جب تصوف نے علمی شکل اختیار کی تو لوگوں کی توجہ اس کی جانب منعطف ہوئی۔ اور بعد کے محققین نے اس کی اصل یعنی ماخذ کا سراغ لگانے کی کوششیں کیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جن حکمائے اسلام نے کام کیا ان میں خلدی (متوفی ۳۴۸ھ مطابق ۹۵۹ء)، ابو نصر سراج (متوفی ۳۷۸ھ مطابق ۹۸۸ء)، ابو بکر الکلاباذی (متوفی ۳۸۰ھ مطابق ۹۹۰ء)، البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء)، القشیری (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۳ء)، ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۳ء) اور امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء) کی تحقیقات کا درجہ مسلمہ طور پر بہت بلند ہے۔

یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ بڑے بڑے صوفیائے کرام اور علمائے نے تصوف کے متعلق اپنے اپنے نظریات پیش کئے۔ بعد ازاں چودھویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی میں مغربی محققین نے تمام گزشتہ تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان میں سب سے پہلے گولڈ زیہر (متوفی ۱۹۲۱ء) کا نام آتا ہے جو ایک جرمن عالم تھا۔ اس کے بعد ایک اور جرمن عالم نولڈیکی (متوفی ۱۹۳۰ء) نے اس موضوع پر نمایاں کام کیا۔ پھر انگریز علمائیں سب سے پہلے پروفیسر نکلسن (متوفی ۱۹۴۵ء) نے تصوف کی طرف توجہ کی اور ۱۹۱۴ء میں اپنی تحقیقی کاوشوں کا نچوڑ ایک کتاب[1] کی صورت میں پیش کیا۔ موصوف تاحین حیات اس موضوع پر کام کرتے رہے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید پروفیسر اے۔ جے آربری کا نام قابلِ ذکر ہے جن کی تحقیقات قابل قدر ہیں۔

اس اثنا میں مصر اور ایران میں بھی تصوف کی تحقیق و تدقیق کا کام ہوتا رہا جن محققین

---

[1] یعنی MYSTICS OF ISLAM

نے اس سلسلے میں گراں قدر کام کیا ان میں مصر کے مصطفیٰ حلیمی پاشا اور ایران کے ڈاکٹر قاسم غنی (متوفی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء) کے اسمائے گرامی معروف ہیں۔ اول الذکر نے تصوف کا اصل خود اسلام کو قرار دیا ہے اور آخر الذکر اس نظریے کے حامل ہیں کہ تصوف کی اصل کا تعلق مختلف منابع سے ہے۔

تصوف کی اصل کے متعلق دو خاص نظریے ہیں[1]

۱۔ تصوف مختلف عناصر کا مجموعہ ہے جن میں درج ذیل عناصر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں:

(الف) مسیحیت۔ (ب) نوافلاطونیت۔ (ج) بدھ مت اور ہندو فلسفہ۔ (د) فلسفہ ایران اور مانویت۔

۲۔ تصوف کی اصل خود اسلام ہے۔

ذیل میں مذکورہ بالا نظریات پر فرداً فرداً بحث کر کے اس نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی کہ کونسا نظریہ صحیح اور قابلِ قبول ہے اور کونسا غلط اور ناقابلِ قبول۔

۱۔ (الف) مسیحیت

اسلامی تصوف اور مسیحی تصوف میں بظاہر جو مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے اس سے مغربی محققین مثلاً گولڈ زیہر، نولڈیکی، فان کریمر اور پروفیسر نکلسن وغیرہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی تصوف بذاتِ خود کوئی مستقل اسلامی نظریہ نہیں بلکہ اس کی اصل کا تعلق مختلف منابع سے ہے جن میں ایک مسیحی تصوف ہے۔

گو یہ کسی حد تک درست ہے کہ اونی لباس اور صومعہ کی شکل میں حجرہ کا رواج اسلام میں مسیحیت سے آیا اور محبتِ الٰہی، فقر، ترکِ دنیا، ذکر و فکر اور ایثار و قناعت کی جو تعلیمات اسلامی تصوف میں پائی جاتی ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا عکس جھلکتا ہے لیکن اسلامی حقایق کی روشنی میں مستشرقین کا یہ خیال کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ صوفیائے کے اونی لباس

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۹۔۲۰، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۴۲۶

کا ذکر کرتے ہوئے نولڈیکی اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے[1] کہ کلمہ صوفی صوف سے مشتق ہے اور دراصل ان زاہد مسلمانوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جنھوں نے عیسائی راہبوں کی تقلید میں زہد اور ترکِ دنیا کی علامت کے طور پر موٹے پشمینہ کا لباس پہنا۔

عیسائی راہبوں کی ایک نمایاں خصوصیّت یہ ہے کہ وہ کسی پرسکون مقام پر صومعہ بنا کر ذکر و فکرِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں حجرہ بنانے اور اس میں بیٹھ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہونے کا رواج بھی مسیحی تصوف سے ہوا ہے[2]۔ محبت الٰہی کی اساس بھی مسیحیت کو قرار دیا جاتا ہے جس میں حضرت عیسٰی کی تین گروہوں سے ملاقات کا ذکر ہے۔ پہلا گروہ دوزخ کے ڈر سے، دوسرا جنت کے لالچ میں اور تیسرا رضائے الٰہی کے حصول کے لئے عبادت میں مصروف تھا۔ آپ نے تیسرے گروہ کو پسند کیا[3]۔

مذکورہ روایت کی بنا پر فقر، ترکِ دنیا، ذکر و فکر اور ایثار و قناعت کو بھی مسیحیت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض مشہور مغربی محققین کی آراء ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

نولڈیکی (متوفی ۱۹۳۰ء) لکھتا ہے[4] کہ صوف کا لباس بھی دراصل نصرانی ہے اور مسلمان صوفیا نے ذکر و فکر کے جو طریقے ایجاد کئے اور ان کو جس طرح عمل میں لائے وہ بھی نصرانیت سے ماخوذ ہیں۔

گولڈ تسیہر (متوفی ۱۹۲۱ء) کا کہنا ہے[5] کہ اسلامی تصوف میں ایثار و قناعت کی جو صفات پائی جاتی ہیں اور دولت اور سرمایہ داروں پر فقر اور فقرا کو جو فضیلت حاصل ہے، یہ خالص اسلامی نہیں بلکہ نصرانیت اور عیسائیت کے مطالعہ اور ان نظریات سے شغف کا براہِ راست

---

[1] MYSTICS OF ISLAM, P2

[2] تاریخ تصوف اسلام، ص ۹۰

[3] ایضاً، ص ۹۲-۹۴

[4] ایضاً، ص ۹۰

[5] ایضاً

نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو احادیث مروی ہیں، وہ بھی درحقیقت عیسائی راہبوں کے عقائد اور اعمال کا عکس ہیں۔ فقر کو جو خصوصیت اور اہمیت اسلام میں حاصل ہے وہ عیسائیت میں بھی ہے اور عیسائیت بہر حال اسلام سے مقدم ہے۔

فان کریمر کا بیان ہے[1] کہ اسلامی تصوف میں جو اقوال مشہور اور جو خیالات مروج ہیں وہ زیادہ تر ایام جاہلیت کی یادگار ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہل عرب زیادہ تر دینِ عیسوی کے پیرو تھے۔ ان عرب عیسائیوں کی بہت بڑی جماعت دنیا سے بیزار اور متنفر تھی۔ یعنی تارک الدنیا ہو چکی تھی۔ یہی دراصل وہ لوگ تھے جو راہب کہلائے۔

پروفیسر نکلسن (متوفی ۱۹۴۵ء) اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں[2] کہ ذکر اور توکل کے نظریات قرآن اور احادیث کی تعلیمات پر مبنی ہیں لیکن اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ تصوف بہت حد تک مسیحیت کا رہینِ منّت ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب عرفائے اسلام میں اسلامی تصوف کی اصل اور ماخذ کے متعلق جس قدر تفصیل سے بحث کی ہے اس سے بھی مجموعی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلامی تصوف کا وجود مسیحیت کا مرہون منت ہے۔

ہمارے خیال میں اسلامی تصوف کی اصل کے متعلق مستشرقین کے نظریات تمام و کمال صحیح نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصوف مسیحیت سے درآمد کی ہوئی کوئی شے نہیں بلکہ خود اسلام کی پیداوار ہے۔ اس کی اصل، اس کا منبع اور ماخذ خود اسلام ہے۔ اس کی روح اسلام کے ابتدائی دور میں بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

صوف کا لباس

اونی لباس کا رواج اسلامی تصوف میں کلی طور پر عیسائیت سے ماخوذ نہیں بلکہ اس

---

[1] تاریخ تصوف اسلام، ص ۸۹

[2] THE IDEA OF PERSONALITY IN SUFISM, P 8.

[3] اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۲۵

کی اصل خود اسلام میں موجود ہے۔ جس کا ثبوت قرآن اور احادیث سے ملتا ہے۔ یہ لباس جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، خود آنحضرتؐ پہنا کرتے تھے۔ یہ لباس عاجزی اور فروتنی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آنحضرتؐ کو مزمل سے خطاب کیا ہے یعنی اے کپڑے لپیٹنے والے رات کو کچھ دیر قیام کیجئے۔[1] سردی سے بچاؤ کے لئے جو کپڑے استعمال کئے جاتے تھے وہ یقیناً گرم موٹے اور اون کے ہوتے تھے۔ یافعی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ صوف کے لباس میں ملبوس تھے۔[2] حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دفعہ آپ نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، آپؐ نے صوف کا لباس زیب تن کیا ہے۔[3]

اب ظاہر ہے کہ بعد کے زمانے میں صوفیا نے جو صوف کا لباس پہنا تو یہ نہ ان کی اختراع ہے اور نہ عیسائی راہبوں سے لیا گیا ہے بلکہ سنت محمدیؐ کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے یہ لباس اختیار کیا ہے۔

صومعہ و دیر

مراقبہ اور مجاہدہ کے لئے صومعہ اور دیر کی شکل میں صوفیائے کرام نے جو حجرے تعمیر کئے اس کے متعلق مستشرقین کی رائے ہے کہ یہ طریقہ عیسائی راہبوں کی وساطت سے اسلام میں داخل ہوا۔ اس کے ثبوت میں ابوھاشم کوفی (متوفی ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء) کا مشہور حجرہ بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔[4] مستشرقین کی یہ رائے بھی درست نہیں کیونکہ صومعہ و دیر کی شکل میں حجرہ کی مثال خود آنحضرتؐ کی عملی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ آپؐ نبوت سے قبل اکثر غار حرا میں کئی کئی دن متواتر مراقبہ اور مجاہدہ میں مشغول رہتے تھے۔ خالق و مخلوق اور کائنات کی ماہیت

۱؎ یا ایھا المزمل قم الیل الا قلیلا۔ (مدثر: ۱)

۲؎ تاریخ تصوف اسلام، ص ۱۰۲

۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً

اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے پُرسکون مقام میں خلوت گزین ہونے کی اشد ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے بغیر ذکر و فکر اور عبادت میں یکسوئی اور یک جہتی میسّر نہیں آسکتی۔[1]

البتہ یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی یہ زندگی قبل از بعثت کی زندگی تھی اس لئے اسے اسلام میں قابل تقلید نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن یہ اعتراض اس بنا پر صحیح نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کی ذات نبوت سے قبل بھی ویسی ہی معصوم اور خطا سے پاک اور منزہ ہے جیسا بعد از نبوت اور نیز آپؐ کی یہ خلوت گزینی پیش خیمہ اور تمہید نبوت تھی اس لئے یہ بھی قابل تقلید ہے۔[2]

اس اعتبار سے زمانۂ مابعد میں صوفیائے کرام نے ذکر و فکر اور عبادتِ الٰہی کے لئے عزلت گزینی اور خلوت نشینی کا جو طریقہ اختیار کیا اس کا اوّلین نمونہ خود آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ تھی۔ البتہ یہ کہنا ضرور صحیح ہے کہ صوفیاؑ اور عیسائی راہبوں کی زندگی میں ایک گونہ مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن ایک چیز کے دوسری چیز سے مماثل اور مشابہ ہونے کی بنا پر ایک کو دوسرے کی اصل یا ماخذ قرار دینا درست نہیں ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صوفیائے کرام کی خلوت نشینی اور عیسائی راہبوں کی گوشہ گیری میں مماثلت اور مشابہت کے باوجود بڑا فرق ہے۔ ان دونوں فریقوں کی حیاتِ روحی میں اصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام کی خلوت نشینی کے لئے حدود مقرر ہیں۔ ان سے تجاوز کرنے کی اسلام میں اجازت نہیں۔ قربِ خداوندی کے حصول کی خاطر صوفیا کی عزلت گزینی اور گوشہ گیری کے خاص اوقات اور حالات ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر حال میں عیسائی راہبوں کی طرح دیگر دینی اور دنیوی فرائض سے قطع نظر کرکے اپنی زندگی خلوت نشینی میں بسر کریں۔[3]

محبتِ الٰہی

محبتِ الٰہی کا نظریہ اسلامی تصوف میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۲۷   [2] ایضاً   [3] ایضاً ص ۲۸

(ترجمہ) اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے ساتھ بے حد محبت رکھتے ہیں[1]۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: (ترجمہ) آپ فرما دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری متابعت کرو پھر اللہ بھی تم سے محبت کریں گے[2]۔ حدیث میں مذکور ہے کہ کوئی بھی تم میں سے مومن کہلانے کا مستحق نہیں تاوقتیکہ وہ مجھے اپنے آباؤ اولاد اور تمام بنی نوع انسان سے زیادہ محبوب نہ سمجھے[3]۔

خدا اور رسول کی یہی محبت تھی جس کی بنا پر مسلمان اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لئے پھرتے تھے اور اپنا مال و متاع راہ خدا میں بے دریغ لٹا دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبتِ الٰہی کی تعلیم خود اسلام نے دی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حضرت عیسٰی ؑ سے متعلق مذکورہ حکایت میں بھی محبتِ الٰہی کی علامات ملتی ہیں۔

فقر

فقر کا نظریہ بھی اسلامی تصوف میں کافی اہم ہے۔ اس کا ماخذ بھی خود اسلام ہے مسیحی تصوف نہیں۔ قرآن میں ارشادِ باری ہے کہ: (ترجمہ) لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور قابلِ ستائش ہے[4]۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ فقر میرا فخر ہے[5]۔

اسلامی تصوف کا فقر مسیحی تصوف کے فقر سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی تصوف کا فقر دل میں طمانیت اور استغنا پیدا کرتا ہے۔ جو فقیر صحیح معنی میں فقیر ہوتا ہے وہ سوائے اللہ تعالٰی کے تمام کائنات سے بے نیاز ہو کر ایسی عزت اور فضیلت حاصل کر سکتا ہے جو کسی اور کیلئے

---

[1] والذین اٰمنوا اشد حبا للہ (بقرہ: ۱۶۵)

[2] قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ (سورۂ آل عمران: ۳۱)

[3] لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔
(اسلامی تصوف اور اقبال ص ۲۸ بحوالہ بخاری شریف جلد اول ص ۷)

[4] یا ایھا الناس انتم الفقرا الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید (سورۂ فاطر، آیۃ: ۱۵)

[5] یعنی الفقر فخری (ایضاً)

ممکن نہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ مال کی بے نیازی، بے نیازی نہیں بلکہ نفس کی بے نیازی بے نیازی ہے[1]۔ صرف مال دار ہونے کے باعث کسی کو غنی نہیں کہا جاسکتا بلکہ غنی درحقیقت وہ ہے جس کا دل غنی ہو۔ فقیر کا ہاتھ متاعِ دنیا سے خالی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کا دل جب ساری کائنات سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو وہ حقیقی عزت اور بزرگی کا مالک بن جاتا ہے۔

بخلاف اس کے مسیحی تصوف میں فقر مفلسی اور گداگری کے مترادف ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے مذموم اور حرام ہے۔ اس کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے (بدرجہا) بہتر ہے[2]۔ اس لحاظ سے اسلامی فقر کی تعلیم مسیحی فقر کی طرح مفلسی اور گداگری نہیں بلکہ مخلوق سے مستغنی ہو کر صرف خدا کا محتاج اور مطیع بننے کا نام فقر ہے۔

ترکِ دنیا

اسلامی تصوف میں ترکِ دنیا کا بھی وہ مفہوم نہیں جو مسیحیت میں ملتا ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر کے مصدرِ حقیقی سے زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کی جائے۔ قرآن میں آیا ہے: (ترجمہ) اور دنیاوی زندگی بجز فریب اور کچھ نہیں[3]۔ اس اعتبار سے دنیا سے محبت کرنا جہالت اور نادانی ہے۔ اسلام میں دنیا سے قطع تعلق کلی طور پر جائز نہیں۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت کا کام انجام دیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے[4]۔ اس لحاظ سے حصولِ آخرت کی خاطر دنیا کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا میں رہ کر سماجی، معاشرتی اور معاشی فرائض کو کماحقہٗ انجام دے اور ساتھ ہی حصولِ

---

[1] لیس الغنیٰ غنی المال ۔ لکن الغنی ۔ غنی النفس (اسلامی تصوف اور اقبال ص ۲۹ بحوالہ مشکوٰۃ شریف) غالباً شیخ سعدی کا یہ مقولہ بھی اسی حدیث قدسی کی تفسیر ہے:

توانگری بدل است نہ بمال   بزرگی بعقل است نہ بسال (گلستانِ سعدی)

[2] الید العلیا خیر من الید السفلیٰ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۶۲) (تصوف اور اقبال ص ۳۰)

[3] وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

[4] الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (ایضاً)

آخرت کے لئے بھی کوشاں ہو۔ کیونکہ "دنیا کی نسبت آخرت ہی زیادہ اچھی اور زیادہ باقی رہنے والی ہے[1]"

لیکن اس کے برعکس مسیحیت میں ترک دنیا کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا و مافیہا سے کلی طور پر قطع تعلق کر کے پہاڑوں اور غاروں میں مجردانہ زندگی بسر کی جائے۔ عیسائی راہب قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ سماجی، معاشرتی اور معاشی غرض اور دیگر تمام فرائضِ زندگی سے بری الذّمہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ترکِ دنیا کی تعلیم اسلام میں مسیحیت سے آئی ہے۔

ذکرِ الٰہی

اسلام میں ذکر الٰہی کی تعلیم خاص طریقہ سے دی گئی ہے۔ قرآن اور حدیث میں ایسے ارشادات ملتے ہیں جن میں ذکرِ الٰہی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ آیا ہے: (ترجمہ) تم میرا ذکر کرو، مَیں تمہارا ذکر کروں گا اور میرا شکر کرو کفرانِ نعمت نہ کرو[2]۔ ایک اور جگہ آیا ہے: اور اپنے رب کا بہت ذکر کر اور تسبیح پڑھ[3]۔ ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے کہ (ترجمہ) اے مومنو! کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو[4]۔ حدیث شریف میں ذکرِ الٰہی کے متعلق مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے مَیں اپنے بندے کے خیال کے نزدیک ہوں، اور مَیں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے دل میں یاد کرے گا تو مَیں بھی دل میں یاد کروں گا[5]۔

---

[1] والآخرۃ خیرٌ و ابقیٰ۔ سورۂ اعلیٰ، آیۃ: ۱۷

[2] فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولا تکفرون۔ سورۂ بقرہ، آیۃ: ۱۵۲

[3] واذکر ربك کثیرًا وسبح بالعشی والابکار۔ سورۂ آل عمران، آیۃ: ۴۱

[4] یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا وسبحوہ بکرۃ و اصیلا۔ سورۂ احزاب، آیۃ: ۴۱

[5] یقول اللہ تعالیٰ انا عند ظن عبدی بی وانا معہٗ اذا ذکرنی۔ فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی (اسلامی تصوف اور اقبال ص ۱۳۱ بحوالہ بخاری شریف ج ۱، ص ۱۹۶)

اس صورت میں ذکرِ الٰہی کو مسیحی تصوف سے اخذ کرنا سراسر بے معنی ہے۔

ایثار

ایثار کا مطلب ہے کسی چیز کے متعلق دوسرے کو اپنی ذات پر صدقِ دل سے ترجیح دینا۔ اسلام میں اس کی تعلیم موجود ہے جس کا ثبوت قرآنِ مجید اور آنحضرتؐ کی ذات والاصفات میں ملتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: (ترجمہ) اور وہ (اصحابِ صفہ) اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں حاجت ہو۔[1] حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جو کوئی کسی چیز کی خواہش کرے، پھر اپنی خواہش کو رَد کر دے اور دوسرے شخص کو اپنی ذات پر ترجیح دے تو اس کو بخش دیا جاتا ہے۔[2]

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ایثار اور ہمدردی مسلمانوں کا خاص شیوہ ہے۔ آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ نے جب کفارِ مکّہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مدینہ کی طرف ہجرت کی تو وہ اس وقت بالکل بے سروسامان تھے۔ مکّہ ترک کرتے وقت اپنی جان کے علاوہ اور کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاسکے تھے۔ انھوں نے اسلام کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا اور بالکل خالی ہاتھ مدینہ پہنچے۔ وہاں کے مسلمانوں نے ان کے ساتھ جس ہمدردی اور اخوت کا ثبوت دیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اہلِ مدینہ کا یہی ایثار تھا جس کی بنا پر وہ انصار کہلائے۔ جب تک مہاجرین اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ ہوئے، انصار ان کی مدد کرتے رہے۔

ان حقائق کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ایثار کا درس مسلمان صوفیا نے عیسائی راہبوں سے نہیں لیا۔

---

[1] و یوثرون علیٰ انفسھم و لو کان بھم خصاصۃ۔ سورۂ حشر، آیۃ: ۹

[2] ایما امرؤ یشتھی شھوۃ فرد شھوتہ وأثر الاخرۃ علیٰ نفسہ غفرلہ۔
(اسلامی تصوف اور اقبال ص ۳۳، بحوالہ مشکوٰۃ شریف)

قناعت

قناعت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے بندے کو جو کچھ عطا ہو، اس پر خوش رہے۔ اسلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قناعت کی تعلیم خود اسلام میں موجود ہے۔ چنانچہ امام غزالی نے اپنی کتاب کیمیائے سعادت میں مندرجہ ذیل دو حدیثوں کو اس سلسلے میں نقل کیا ہے [۱]

(الف) اس شخص کو بشارت ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائی اور بقدر کفایت رزق عنایت فرمایا۔ اور اس شخص نے اس پر قناعت کی۔

(ب) تم شبہات سے احتراز کرو۔ مخلوقات میں سب سے بڑے عابد ہو گے اور جو کچھ تمہاری ملک میں ہے اس پر قناعت کرو۔ بہترین شکر گزار لوگوں میں تمہارا شمار ہو گا۔ اوروں کے لئے اس کو پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ تم اچھے مومن ہو گے۔

(ب) نو افلاطونیت

مغربی محققین کا ایک خیال یہ ہے کہ مسیحیت کے علاوہ یونانی فلسفہ اشراق یعنی فلسفۂ نو افلاطونیت بھی تصوف کے منابع میں سے ایک اہم منبع ہے[۲] اس کے ثبوت میں یہ دلائل پیش کئے جاتے ہیں کہ صوفیہ کے عقاید میں عشق اور وحدت الوجود کے جو خاص نظریات پائے جاتے ہیں وہ فلسفہ نو افلاطونیت میں موجود ہیں۔ اور چونکہ یونانی فلسفے کے مذکورہ نظریات اسلامی تصوف کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے اس لئے اسلامی تصوف کے یہ نظریات فلسفۂ نو افلاطونیت سے ماخوذ ہیں۔ یہاں پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ نو افلاطونیت اور اس کے بنیادی اصولوں کا تھوڑا سا ذکر کر دیا جائے تاکہ قارئین حقیقت کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

۱؎ کیمیائے سعادت، ص ۲۹۳

۲؎ دائرۃ المعارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۴۲۶

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین لکھتے ہیں[1] کہ فلسفۂ نو افلاطونیت قدیم یونانی فلسفی افلاطون (متوفی ۳۴۷ ق م) کے افکار و خیالات کی شرح و تفسیر میں تیسری صدی عیسوی میں ایک مستقل سکول کی شکل میں وجود میں آیا۔ ایک عرصہ تک لوگ امونیوس ساکلس (متوفی ۲۴۲ء) کو، جو اسکندریہ مصر میں یونانی فلسفہ کا استاد تھا، اس جدید مکتبِ فکر کا بانی سمجھتے رہے[2]۔ لیکن تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس مکتب کا حقیقی بانی ملاطینوس (متوفی ۲۷۰ء) ہے[3]۔ جو امونیوس کا شاگرد تھا۔

فلسفہ نو افلاطونیت کا بنیادی مسئلہ جو خاص طور سے اسلامی تصوف پر اثر انداز ہوا، وحدت الوجود ہے۔ تاریخ تصوف اسلام میں لکھا ہے[4] کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وجود دراصل واحد ہے اور وہی وجودِ واحد دیگر جملہ موجودات کا منبع ہے۔ تمام کائنات بطریق تجلی اسی وجودِ واحد سے نکلی ہے اور انجام کار اسی میں محو ہو جائے گی۔ گویا وجود واحد کے سوا جو کچھ بھی موجود ہے صرف اس وجودِ واحد کا ظل اور پرتو ہے۔ وہ خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ اس نظریے کو اسلامی تصوف میں ہمہ اوست کہتے ہیں۔ البتہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وجودِ واحد کی نمود ہونے کے اعتبار سے کائنات کی تمام اشیا اس وجودِ واحد سے صادر ہوئی ہیں اور وہ خود کسی شے سے صادر نہیں ہوا۔ یہ نظریہ اسلامی تصوف میں ہمہ از اوست کہلاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام وحدت الوجود کے مقابلے پر وحدت الشہود ہے۔ اوّل الذکر کو توحید وجودی اور آخر الذکر کو توحید شہودی بھی کہتے ہیں۔

آگے چل کر اس کتاب میں لکھا ہے[5]۔ کہ خدا عین کائنات ہے یعنی خود ہی کائنات ہے۔

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۳۵

[2] مختصر تاریخ فلسفہ یونان، ۲۷۲-۲۷۴

[3] فلاطینوس ۲۰۴ء یا ۲۰۵ء میں مصر میں بمقام لائسو پولس پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی۔ فلسفہ میں اپنے استاد امونیوس سے گیارہ سال متواتر درس حاصل کیا۔ ۲۴۴ء میں وہ روم چلا گیا جہاں اس نے اپنے جدید مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی۔ ۲۷۰ء بمقام کامپانیا اس نے انتقال کیا۔ (مختصر تاریخ فلسفہ یونان، ص ۲۷۲-۲۷۴)

[4] تصوف تاریخ در اسلام، ص ۱۰۵

[5] ایضاً، ص ۱۰۶-۱۰۷

گویا خدا اور کائناتِ حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ خدا کو کسی صفت سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کے لئے وجود، موجود، جوہر، حیات وغیرہ کی تعبیرات ناقص ہیں۔ خدا تمام صفات اور تعبیرات سے منزّہ ہے، اسے کسی طرح بھی تصور میں نہیں لایا جاسکتا۔ وہ ہر توصیف اور تعبیر سے بالا ہے۔ خدا کے بارے میں فکر کو عمل میں نہیں لاسکتے کیونکہ فکر دو چیزوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اول فکر کرنے والا دوم وہ شے یا موضوع جس پر فکر کیا جائے۔ نیز فکر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ فکر کرنے والا کسی حالت کا طالب ہو علاوہ اس حالت کے جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ اور یہ امر دوئی کو مستلزم ہے جو خدا کی وحدانیت کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے۔ خدا واجب الوجود اور بنفسہٖ کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے تجزیہ اور تعدد سے بری ہے۔ وہ جملہ اشیا کو محیط اور لامحدود ہے۔ اس کی طرف ہر نسبت عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔ علم اور ادراک کی نسبت بھی غلط اور توحید کے منافی ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے جو معلوم اور مدرک ہو۔ حسّ اور عقل کے ذریعہ خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے مشاہدہ اور ذوق وشوق لازمی ہے۔

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین لکھتے ہیں[۱] کہ رفتہ رفتہ جب اسلام نے ترقی کی اور مسلمانوں نے سرزمینِ عرب سے نکل کر شام، عراق، ایران، فلسطین اور مصر وغیرہ کو فتح کرلیا تو ان ممالک میں نوافلاطونیت کے یہ اصول جاری وساری تھے۔ عباسیوں کے عہد خلافت (۱۳۲ھ تا ۲۱۸ھ۔ مطابق ۷۵۰ء تا ۸۳۳ء) میں مسلمان عالموں اور فلسفیوں نے مختلف یونانی علوم مثلاً طب، ہیئت، جغرافیہ، مابعد الطبیعات، الہیات، نفسیات، منطق، سیاسیات، اخلاقیات وغیرہ کو عربی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ ان علوم کے ساتھ انھوں نے فلسفہ نوافلاطونیت کو بھی اپنایا اور پھیلایا۔ جدید تحقیق کے مطابق الکندی (متوفی ۲۷۰ھ مطابق ۸۸۳ء) پہلے شخص ہیں جو مسلمانوں میں فلسفی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ افلاطون کے پیرو اور اس کے فلسفہ کے شارح تھے۔ ان کے بعد مسلمانوں میں فلسفۂ افلاطون کے اور بہت سے مفسرین پیدا ہوئے جن میں زیادہ مشہور الفارابی (متوفی ۳۳۹ھ مطابق ۹۵۰ء)، ابنِ مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء) اور ابنِ سینا

۱؎ اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۳۷-۳۸

مطابق ۷۷۶ء) نے انہی خیالات سے متاثر ہو کر اپنی سلطنت کو خیر باد کہہ کر جنگلوں کی راہ لی۔ یہ واقعہ گوتم بدھ کے واقعہ سے بالکل مشابہ ہے۔ بدھ بھی اپنی دنیا، حکومت اور اہل و عیال کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی لکھتے ہیں[۱] کہ بدھ مت کے عقیدہ کی رُو سے یہ دنیا شر و فساد اور دکھ درد سے بھری ہوئی ہے۔ اس سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر کے اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی، پرہیزگاری، اعمالِ خیر، تفکر اور مراقبہ میں مشغول کر دے، اور اس طرح شہواتِ نفسانی اور ہوا و ہوس سے خود کو آزاد کرے اور انجام کار کمال کے درجہ میں پہنچ کر "نروان" یعنی فضائے کامل حاصل کرے۔

اسلامی تصوف کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہندو فلسفہ سے متاثر ہوا ہے، اور بہت سی باتیں ہندو فلسفہ سے اس کے اندر داخل ہوئی ہیں۔ اسلام جب آہستہ آہستہ عرب سے نکل کر

ھ۳ MYSTICS OF ISLAM, P 8

ھ۴ خواجہ فریدالدین عطار لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادھم بلخ کے بادشاہ تھے۔ تخت و تاج چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے اور بالآخر حقیقت الٰہیہ کو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ (تذکرۃ الاولیا، ص ۵۶)۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے ایک تحقیقی مضمون میں لکھتے ہیں کہ اول تو یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچتی کہ ابراہیم بن ادھم کے نام سے کسی تاریخی شخص کا وجود بھی تھا یا نہیں۔ اس لئے کہ ان کی زندگی کے واقعات جس طرح کہ عام صوفیوں نے بیان کئے ہیں گوتم بدھ کے حالات سے اس قدر ملتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک ان کی شخصیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور گوتم بدھ کا قصہ ہی ابراہیم بن ادھم کے نام سے صوفیوں میں مشہور ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابراہیم بن ادھم کی شخصیت کو بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس نوعیت کے ترکِ دنیا کو اسلامی تصوف کی تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ (ملاحظہ ہو: اقبال: اکتوبر ۱۹۵۴ء، مضمون: تاریخ تصوف کا ایرانی اور ہندی پس منظر از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص ۲۔ نیز دیکھیں اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۹۰-۹۱)

ھ۱ تاریخ تصوف در اسلام، ص ۱۶۱

عقیدۂ فنا: اسلامی تصوف کا عقیدۂ فنا بھی ہندو مذہب سے ماخوذ نہیں ہے۔ دونوں مذاہب کے عقیدۂ فنا میں مشابہت ضرور ہے لیکن بایں ہمہ اصول کے اعتبار سے دونوں میں بیّن فرق ہے۔ ہندو مذہب میں فنا صرف فردیت کی فنا تک محدود ہے۔ یہ اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی رُو سے انسانی ہستی کی کوئی قدر نہیں۔ اس کا مقصد اعلیٰ صرف اس قدر ہے کہ انسان خود کو بکلّی فنا کر دے۔ یہ نفی محض ہے برخلاف اس کے اسلامی تصوف فنا کے بعد بقا کا بھی قائل ہے۔ یعنی اس کی رُو سے روح انسانی فنا ہونے کے بعد خدا سے متصل ہو کر بقائے دوام حاصل کر لیتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اخلاقی قدر بہت بڑھ جاتی ہے۔ دونوں نظریات کا اصولی فرق اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلامی تصوف کا عقیدۂ فنا ہندو مذہب کے عقیدہ فنا سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ دونوں نظریات مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی دنیا ہندو فلسفہ کے افکار و خیالات سے اس وقت تک واقف نہیں ہوئی تھی جب تک ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء) کی کتاب الہند وجود میں نہیں آئی، جو انھوں نے ہندوستان میں رہ کر تصنیف کی۔ اور جس میں انھوں نے ہندوؤں کے احوال، عقائد، علوم اور مذاہب پر بہت دقّتِ نظر سے بحث کی ہے۔ البیرونی کی یہ کتاب ۴۲۵ھ مطابق ۱۰۳۴ء میں لکھی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک اسلامی تصوف نے خود ایک علمی اور نظری صورت اختیار کر لی تھی[1] اس لحاظ سے ہندو

---

[1] دائرۂ معارف اسلامیہ میں کلمۂ تصوف کے ذیل میں لکھا ہے کہ پہلی دو صدیوں تک تو مذہب تصوف کو کلمات قصار میں پیش کیا جاتا تھا اور اس طریقہ کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مشائخ صوفیہ نے یہ محسوس کیا کہ اپنے عقائد کو واضح تر صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ محاسبی (متوفی ۲۴۳ھ) پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے صوفیہ متقدمین کی تعلیمات کو مدون کیا۔ ان کی کتاب "رعایۃ" میں مسلک تصوف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ اپنے اسی نظریہ محاسبہ کی بنا پر محاسبی کہلائے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں بسر کی جو بہت جلد تصوف کے سب سے بڑے مرکزوں میں سے ایک مرکز بننے والا تھا اور جہاں ایک مدت تک جنید (متوفی ۲۹۷ھ) بھی ان کے مریدوں میں شامل رہے۔ جنید نے توحید اور فنا کے عقاید کی اس طرح تدوین کی جس سے ان کے معاصرین اور بعد کے علما کو اطمینان ہو گیا کہ تصوف سنت کے عین مطابق ہے۔ صوفیہ کے تمام سلسلوں کا اسناد آپ تک پہنچتا ہے۔ (دیکھیں دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۴، ص ۴۳۱)

شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا، نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑنے لگتا اور نہ شطح یعنی خلافِ شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات، استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے۔ وہ بہشت کی رغبت اور آرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف اور ہراساں رہتے۔ کشف و کرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے۔ سرمستی اور بے خودی کی کیفیات بھی ان پر شاذ و نادر ہی طاری ہوتی۔ اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات و خوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں، ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہیں ہوئی تھیں کہ ملکہ بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے وہ بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں اپنے تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ طبیب ہی نے مجھ کو بیمار کیا ہے۔ یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ اس دور میں جسے احسان یا تصوف کا پہلا دور کہنا چاہیے، اہلِ کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا ہے۔

دوسرا دور: دوسرے دور کے متعلق شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں[1] کہ حضرت جنید جو گروہ صوفیہ کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہلِ کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریق پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے لیکن ان میں سے جو خواص تھے انھوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ وہ مستقل طور پر ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ

---

[1] ہمعات (اردو ترجمہ)، ص ۴۷-۴۹

تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی، استتار، اُنس اور وحشت کے احوال وکوائف ظاہر ہوتے۔ اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان کرتے۔

تیسرا دَور: اس دَور کے متعلق شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے[1] کہ سلطان الطریقہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں تصوف کے اندر ایک اور تغیّر رونما ہوا۔ اس دَور میں اہلِ کمال میں سے عوام تو حسبِ سابق شرعی اوامر واعمال پر ٹھہرے رہے اور خواص نے باطنی احوال وکیفیات کو اپنا نصب العین بنایا۔ اور جو خواص الخواص تھے، انھوں نے اعمال واحوال سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کی اور اس "جذب" ہی کی وجہ سے ان کے سامنے "توجہ" کی نسبت کا راستہ کھل گیا، اور اسی سے تعینات کے سب پردے ان کے لئے چاک ہو گئے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیا کے وجود کا انحصار ہے اور وہی ذات سب اشیا کی قیوم ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے اور ان کے نقوش اسی کے رنگ میں رنگے گئے۔

چوتھا دَور: اس دَور کے بارے میں شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں[2] کہ آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہلِ کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ لوگ کیفیات واحوال[3] کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائقِ تصوف کی

ھ۱ ہمعات (اردو ترجمہ)، ص ۴۹-۵۰۔ ھ۲ ایضاً، ص ۵۰-۵۲

ھ۳ احوال، حال کی جمع ہے اور حال سے تصوف میں مراد وہ کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے قلبِ سالک پر طاری ہوتی ہے۔ سالک کو اس وہبی کیفیت پر بذاتِ خود کوئی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ دل پر طاری ہو جائے تو وہ اپنی کوشش اور ارادہ سے اس کو ہٹا نہیں سکتا۔ اگر خود بخود چلی جائے تو کسب واجتہاد سے وہ اس کو واپس نہیں لا سکتا۔ یہ محض خداوند کریم کی عنایت ہے۔ برخلاف مقام کے کہ اس پر پہنچنا سالک کے ذاتی کسب وعمل سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کسبی ہے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ کسی مرشد کی رہنمائی میں حیاتِ روحی کے جو منازل طے کر کے درجۂ کمال یعنی فنافی اللہ کے بعد بقا باللہ کا مرتبہ

بحث و تدقیق کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی؟ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزّلات دریافت کئے۔ اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا؟ اور یہ صدور کس طرح عمل میں آیا؟ غرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔

مختصر یہ کہ تصوف کے مذکورہ بالا چاروں طریقے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملأ اعلیٰ میں بھی ان کی قدر و منزلت ہے۔ اربابِ تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر طبقے کے بزرگوں کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں پر ناپتے پھریں[1]

حاصل کیا جاتا ہے، اس کو ایک سفر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اصطلاح تصوف میں اس راستے کو سلوک، اس پر چلنے والے کو سالک، منازلِ راہ کو مقامات اور ان مقامات میں سے گزرنے کے دوران سالک کے دل پر جو وجدانی کیفیات طاری ہوتی ہیں ان کو احوال کہتے ہیں۔ مقامات سات ہیں: یعنی توبہ، ورع، زہد فقر، صبر، توکل، رضا اور احوال دس ہیں یعنی مراقبہ۔ قرب، محبت، خوف، رضا، شوق، انس، اطمینان مشاہدہ اور یقین۔ (تاریخ تصوف در اسلام، ص ۲۱۰- ۲۱۲- اسلامی تصوف اور اقبال، ص)۔
احوال اور مقامات کا علم صرف سالک کو ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ؎

اپنے احوال و مقامات سے میں واقف ہوں ۔۔۔ وہ تو حالات ہیں جو اہل جہاں تک پہنچے

[1] ہمعات (اردو ترجمہ)، ص ۵۲-۵۳

دوسرا باب

صوفیائے عظام کے سلسلے

خلیق احمد اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں لکھتے ہیں[1] کہ چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی کو اسلامی تصوف کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانے میں تصوف کا فلسفہ پورے طور پر ترتیب دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اسی زمانے میں بعض روحانی سلسلوں کی داغ بیل بھی پڑی، گو ان کا عروج ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس دور میں تصوف کے نشوونما کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے چند ممتاز مشائخ کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ مثلاً امام غزالی (متوفی ۱۱۱۱ء)، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (متوفی ۱۱۶۶ء)، شیخ نجیب الدین عبدالقاہر سہروردی (متوفی ۵۶۳ھ)، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۱۱۶۵ء - ۱۲۴۰ء)، شیخ شہاب الدین سہروردی (۱۱۴۴ء - ۱۲۳۴ء) یعنی برادر زادہ شیخ نجیب الدین سہروردی وغیرہ، اور شعرا میں حکیم سنائی، نظامی گنجوی، خواجہ فریدالدین عطار اور ذرا بعد میں مولانا جلال الدین رومی وغیرہ[2]۔

حاصل کلام یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی کے آخر تک تصوف بحیثیت ایک فن کے انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ امام غزالی، شیخ اکبر اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے اس کا فلسفہ، اصطلاحات، بنیادی مسائل، سب کی وضاحت کر دی تھی۔ حکیم سنائی اور خواجہ عطار نے عشق الٰہی کی آگ پھونکنے میں اپنے شاعرانہ کمالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اب

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۰۲

[2] ایضاً، ص ۱۰۳-۱۲۴

تصوف کا صرف عوامی تحریک بننا باقی تھا۔ ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں سلسلوں کی تنظیم سے وہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ اس صدی میں روحانی سلسلے وجود میں آئے اور ان کی تشکیل سے تصوف کی تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ اسلامی تصوف کی تاریخ اس صدی میں ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی۔

حقیقت میں صوفیہ کے روحانی سلسلے تصوف کے ارتقا اور نشوونما کی آخری منزل ہیں۔ اس کے بعد تصوف کی تحریک زوال و انحطاط کی مختلف حالتوں سے گزرتی رہی اور تصوف آہستہ آہستہ ایک محض خیال، نیم مذہبی رسم، ایک بے عمل اور با آرام زندگی کا وسیلہ، گداگری کا بہانہ اور جاہل اور سادہ لوگوں کو دھوکا دینے کا ذریعہ بن گیا[۱] تاریخ تصوف اسلام میں اس سلسلے میں ایک دلچسپ قول درج ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے: تصوف حال تھا لیکن اپنے دور انحطاط میں بُرا حال بن گیا۔ وہ احتساب تھا لیکن اب اس نے اکتساب کی شکل اختیار کرلی۔ وہ استتار تھا، لیکن اب وہ اشتہار نظر آنے لگا..... پہلے وہ صدور کی عمارت تھا، اب غرور کا مرکز بن گیا۔ پہلے وہ تقشف تھا، اب تکلف کا جامہ اس نے پہن لیا۔ پہلے وہ تخلق تھا، اب تملق بن گیا۔ پہلے وہ قناعت تھا، اب اس نے فجاعت کا روپ بھر لیا[۲] علاوہ ازیں ہجویری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ابوالحسن الفوشنجی (متوفی ۳۴۸ھ) کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی تصوف کے زوال و انحطاط کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ قول یہ ہے: آج کل تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے، لیکن زمانہ سابق میں یہ ایک حقیقت تھا بغیر نام کے[۳] اس میں شک نہیں کہ تصوف کی تحریک میں اصلاح و تجدید کی برابر کوشش کی گئی لیکن بنیادی طور پر نہ اس کے فلسفہ میں کوئی اضافہ ہوا اور نہ اس کے عملی پروگرام میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی۔ امام غزالی اور شیخ اکبر کے افکار کے گرداگرد تصوف کی ساری دنیا گردش کرتی رہی۔ ان بزرگوں کی تصانیف کے حاشیوں اور خلاصوں سے باہر

۱؎ OUT LINES OF ISLAMIC CULTURE, P 547، اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۳۳

۲؎ تاریخ تصوف اسلام، ص ۳۳۲۔ اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۳۳

۳؎ کشف المحجوب (ترجمہ نکلسن)، ص ۴۴۔ دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۴۲۹

نکلنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ مثنوی مولانا روم نے شاعری کی ساری دنیا کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ غرض ہر لحاظ سے ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں تصوف کی تحریک معراج کمال کو پہنچ گئی[1]

سلاسل تصوّف کا تاریخی پس منظر

اس سے قبل کہ ہم صوفیہ کے روحانی سلسلوں پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیں جن میں یہ سلسلے وجود میں آئے۔ اس ضمن میں تاریخ مشائخ چشت میں لکھا ہے[2] کہ عجمی مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی تو عرصے سے زوال پذیر تھی لیکن ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں اپنی تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گئی۔ سیاسی نظام بے جان ہو گیا اور سماج میں ابتری اور انتشار پھیل گیا۔ عطاملک جوینی کا بیان ہے[3] کہ اگر خوارزم شاہ سو فوجی افسروں کو طلب کرتا تھا تو بمشکل دس حاضر ہوتے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تقریباً یہی حال تھا۔ ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ بغداد کے وہ علاقے جہاں کبھی تاجروں کا ہجوم رہتا تھا، اب کبوتر بازوں کے اڈے بن گئے تھے[4] اخلاقی زبوں حالی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تمام وہ انسانی اوصاف جو سماج میں کامرانی، خوشحالی اور اطمینان کی ضمانت ہوتے ہیں، ختم ہو چکے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی زوال سے پہلے اخلاقی زوال کی ساری منزلیں طے ہو چکی تھیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا زوال منگولوں کے حملے کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ منگولوں کے حملے مسلمانوں کے زوال کا نتیجہ تھے، سبب نہیں تھے۔ بہرحال اسلامی دنیا میں فتنۂ تاتار سے بڑھ کر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی۔ ان کی تباہ کاریوں

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۴ [2] ایضاً، ص ۱۲۵

[3] تاریخ جہانگشاہی جوینی (گب میموریل سیریز)، ص ۳۳-۳۵

[4] THE RENAISSANCE OF ISLAM, P7.

سے عجم کے زرخیز اور لہلہاتے علاقے بنجر اور ویران ہو گئے۔ ہر طرف تباہی اور بربادی کے ہولناک مناظر دکھائی دینے لگے۔ ساری اسلامی دنیا زیر وزبر ہو گئی۔ بغداد جو اسلامی تمدن کا گہوارہ تھا خون میں لت پت ہو گیا۔ دریائے دجلہ مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گیا اور میلوں تک اس کا پانی لال ہی لال نظر آنے لگا۔ خانقاہیں اور مدرسے بے نور اور بے چراغ ہو گئے۔ گھر ویران اور مسجدیں تباہ ہوئیں۔ علم وادب کے مرکز فنا ہوئے۔ کتب خانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ علمائے یگانہ تیغ بیداد کا نشانہ بنے۔ غرض ایک دنیا بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہو گئی[1] سعدی کا یہ جاں سوز مرثیہ جس میں اب بھی سوزِ دل کی بو آتی ہے بغداد کے کھنڈرات میں گونجنے لگا:

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین   بر زوال ملکِ مستعصم امیر المومنین۔!

ای محمدؐ گر قیامت سر برون آری زخاک   سر برون آر و قیامت درمیان خلق بین

ان روح فرسا مناظر کو دیکھ کر طبیعتیں خود بخود تصوف کی طرف راغب ہو گئیں۔ انابت، خضوع، تضرع، توکل، جو تصوف کے خاص مقامات ہیں خود بخود دل پر طاری ہو گئے۔ اس زمانے کے صوفیہ نے مسلمانوں کی سیاسی اور ذہنی ابتری کے دردناک نظارے دیکھے ۔ ان پر ان حالات کا بڑا اثر تھا۔ ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ ؎

دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لئے روحانی سلسلوں کی تنظیم شروع کر دی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سلسلوں کے عروج سے اسلامی معاشرے کو جو فائدہ پہنچا وہ یہی تھا کہ مسلمانوں کی پریشاں نظری ختم ہو گئی۔ ان کی طبیعتیں ایک چیز پر لگ گئیں اور ان کے ذہن ایک مرکز پر آ گئے۔

خلیق احمد لکھتے ہیں[1] کہ قوموں کی زندگی میں سب سے زیادہ خطرناک وہ وقت ہوتا ہے جب سیاسی انتشار ذہنی انتشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ صوفیائے کرام نے ذہنی انتشار کو دور کرنے میں جس بالغ نظری کا ثبوت دیا وہ محتاج بیان نہیں۔ اسلامی دنیا کا شاید ہی کوئی

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۶-۱۲۷

ایسا گوشہ باقی ہو جہاں خانقاہیں قائم نہ ہوئی ہوں اور عوام کی اصلاح وتربیت کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔ جو قوم منگولوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں سے مضمحل ہو کر نبضیں چھوڑ چکی تھی تصوف کے ذریعہ پھر ایک بار زندہ ہوئی۔ زندگی کی یہ نئی لہر تین طاقتوں کی پیدا کی ہوئی تھی۔ خدا پر اعتماد اور بھروسہ۔ انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے لئے قربان کر دینے کا جذبہ۔ اور اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے کا عزم۔

فطرت کا اندازہ بھی خوب ہے۔ جب زوال انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ انتہا ہی تجدید و احیا کی صورتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جب تباہی حد سے گزر جاتی ہے تو ترقی کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ تخریب میں تعمیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ شکست میں فتح کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور دشمنوں سے ہمدردی کرا دی جاتی ہے۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا ہے:۔

ہر بنای کہنہ کا باداں کنند — اول آن بنیاد را ویراں کنند

منگولوں نے جس بے دردی اور سفاکی کے ساتھ اسلام کے سیاسی اور سماجی نظام کو درہم برہم کیا اس سے کون واقف نہیں۔ پھر انھیں دشمنانِ اسلام کو حلقہ بگوش اسلام بنا کر ان ہی سے مسلمانوں کی اجڑی ہوئی بستیوں کو از سر نو آباد کرنے کا کام لیا گیا۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

خواجہ فریدالدین عطارؒ کو ایک مغل نے شہید کیا۔ پھر وہی مغل ان کے مزار کا مجاور بنا۔ بغداد کی جامع القصر کو ہلاکو کے حکم سے تباہ کیا گیا اور پھر اسی کے حکم سے اس کی مرمت کی گئی۔ اس عہد کے ان شعرا میں جنھوں نے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر تصوف کی طرف رخ کیا اور پھر ساری فضا کو صوفیانہ جذبات سے معمور کر دیا۔ مولانا رومؒ، شیخ سعدیؒ، اوحدیؒ اور عراقی خاص طور سے مشہور ہیں۔ مولانا رومؒ ابتدائی زمانے میں علم ظاہری کے ماہر تھے۔ بڑے تزک و احتشام سے ان کی سواری نکلتی تھی۔ ایک دن شمس تبریزی نے راہ روک لی اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا:

علم کز تو ترا نہ بستاند — جہل از آن علم بہ بود بسیار

مولانا پر ایسا اثر ہوا کہ علم ظاہری سے طبیعت ہٹ گئی اور علم باطنی کی طرف رغبت پیدا ہو گئی۔ اور پھر مشاہیر صوفیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دمشق میں طالب علمی کے زمانے میں شیخ اکبر محی الدین

ابن عربی سے ملاقات ہوئی۔ بعد کو ان کے مرید خاص مولانا صدرالدین قونوی سے صحبتیں رہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی فیض حاصل کیا۔ مولانا روم کی مثنوی ان کی شہرتِ دوام کا باعث بنی اور لوگوں کو اس کی مقبولیت کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی[1]

اس زمانے میں ایک طرف اگر شعرا نے اپنے دل گداز اشعار کے ذریعہ صوفیانہ خیالات کی ترویج و اشاعت کی تو دوسری طرف صوفیائے عظام نے روحانی سلسلوں کی ترتیب و تنظیم سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ولایتوں کی تقسیم اور قطب و ابدال وغیرہ کی نوعیت پر عموماً تو ہمانہ سطح پر غور کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منگولوں کی پیدا کی ہوئی ذہنی ابتری کو مشائخ نے اس طرح پر ختم کیا کہ چپہ چپہ پر اپنا روحانی نظام قائم کر دیا۔ اور ہر جگہ لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے مقامی ذمہ داری کے ساتھ کوششیں کیں[2]۔

دائرۂ معارف اسلامیہ میں مذکور ہے[3] کہ صوفیہ کے مشہور سلسلے کل چودہ ہیں جنھیں چودہ خانوادے کہا جاتا ہے۔ نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ جو حضرت ابو بکرؓ کے ذریعہ آنحضرتؐ تک پہنچتا ہے۔ باقی تمام سلسلے حضرت علیؓ سے ہو کر آنحضرتؐ سے ملتے ہیں۔ ایچ۔ اے۔ روز نے سر ڈینزل ابٹسن اور سر ایڈورڈ میکلیگن کی تحقیقات کی روشنی میں ایک ایسا خاکہ مرتب کیا ہے جس سے تمام مشہور سلسلوں کا پتا چلتا ہے۔ وہ خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے[4]۔

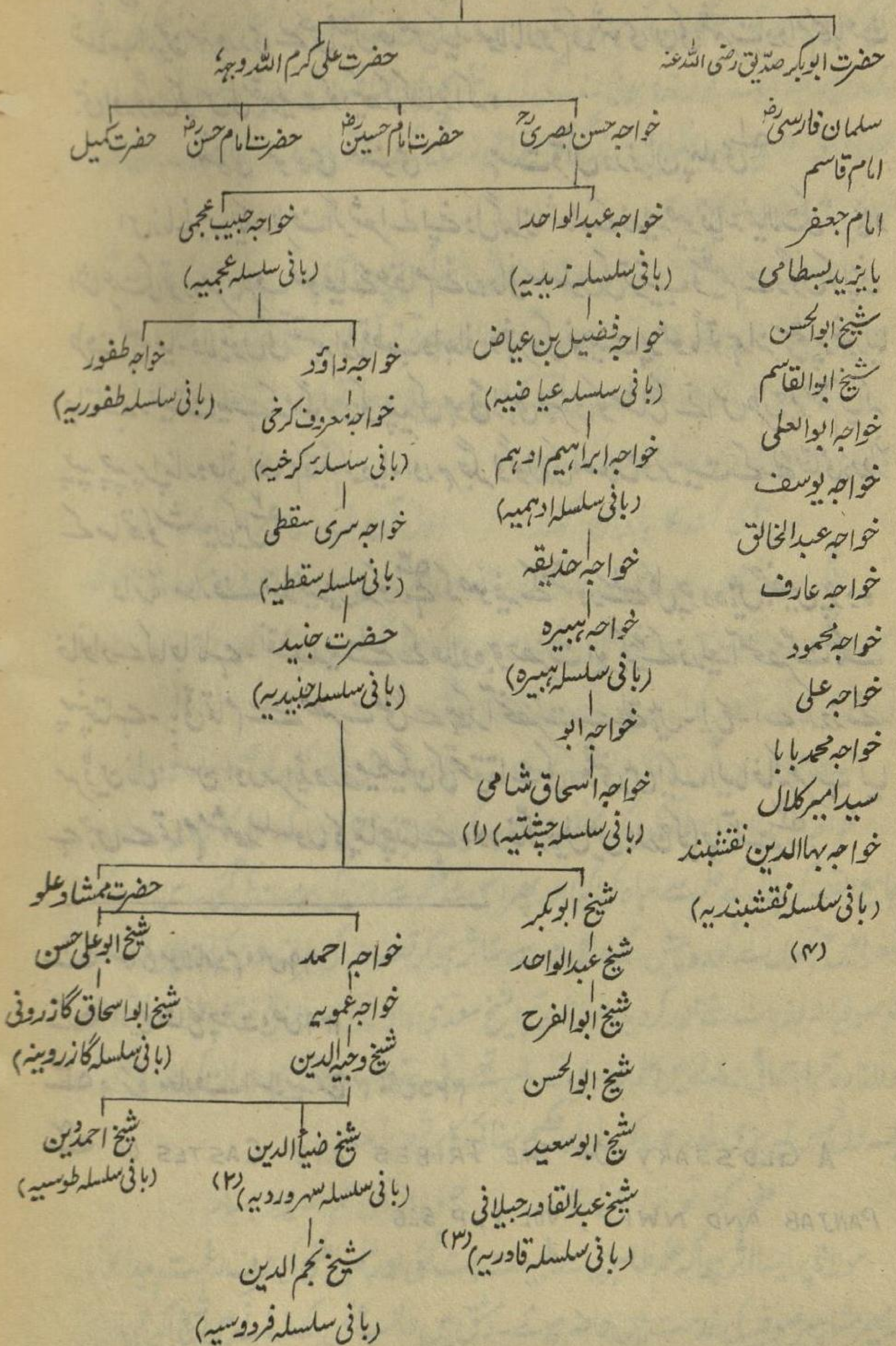
---

[1] سوانح مولانا روم، ص ۶۹

[2] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۹

[3] دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۴۲۵

[4] A GLOSSARY OF THE TRIBES AND CASTES OF PANJAB AND NWFP, VOL 1, P 526.



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
حضرت علی کرم اللہ وجہہ
سلمان فارسی رض
امام قاسم
امام جعفر
بایزید بسطامی
شیخ ابوالحسن
شیخ ابوالقاسم
خواجہ ابوالعلی
خواجہ یوسف
خواجہ عبدالخالق
خواجہ عارف
خواجہ محمود
خواجہ علی
خواجہ محمد بابا
سید امیر کلال
خواجہ بہاالدین نقشبند
(بانی سلسلہ نقشبندیہ)
(۴)
خواجہ حسن بصری رح
حضرت امام حسین رض
حضرت امام حسن رض
حضرت کمیل
خواجہ عبدالواحد
(بانی سلسلہ زیدیہ)
خواجہ فضیل بن عیاض
(بانی سلسلہ عیاضیہ)
خواجہ ابراہیم ادہم
(بانی سلسلہ ادہمیہ)
خواجہ حذیفہ
خواجہ ہبیرہ
(بانی سلسلہ ہبیرہ)
خواجہ ابو
خواجہ اسحاق شامی
(بانی سلسلہ چشتیہ) (۱)
خواجہ حبیب عجمی
(بانی سلسلہ عجمیہ)
خواجہ داؤد
خواجہ معروف کرخی
(بانی سلسلہ کرخیہ)
خواجہ سری سقطی
(بانی سلسلہ سقطیہ)
حضرت جنید
(بانی سلسلہ جنیدیہ)
خواجہ طفور
(بانی سلسلہ طفوریہ)
شیخ ابوبکر
شیخ عبدالواحد
شیخ ابوالفرح
شیخ ابوالحسن
شیخ ابوسعید
شیخ عبدالقادر جیلانی
(بانی سلسلہ قادریہ) (۳)
حضرت ممشاد علو
خواجہ احمد
خواجہ عمویہ
شیخ وجیہ الدین
شیخ ضیاالدین
(بانی سلسلہ سہروردیہ) (۲)
شیخ نجم الدین
(بانی سلسلہ فردوسیہ)
شیخ ابوعلی حسن
شیخ ابواسحاق گازرونی
(بانی سلسلہ گازرونیہ)
شیخ احمد دین
(بانی سلسلہ طوسیہ)

اس خاکے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے مشہور سلسلے یا خانوادے کون کون سے ہیں اور ان کا موسس اعلیٰ کون ہے؟ نیز یہ پتا چلتا ہے کہ سارے سلسلے تقریباً چشتیہ، سہروردیہ قادریہ اور نقشبندیہ سلسلوں کی شاخیں ہیں۔

اگر مسلمانان پاک و ہند کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی روحانی زندگی کی اصلاح و تربیت کا کام چھ سلسلوں یعنی چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ قادریہ، شطاریہ اور نقشبندیہ نے انجام دیا[1] لیکن ان چھ سلسلوں میں بھی زیادہ شہرت اور مقبولیت چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کو حاصل ہوئی[2] چنانچہ ذیل میں ہم ان چار سلسلوں کا فرداً فرداً تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ

شیخ محمد اکرام اپنی کتاب آب کوثر میں لکھتے ہیں[3] کہ پاک و ہند کے روحانی سلسلوں میں سب سے زیادہ شہرت چشتیہ خاندان کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں کئی خصوصیتیں ایسی تھیں جنھیں اس سرزمین کے حالات خاص طور پر سازگار تھے مثلاً موسیقی اور سماع کا رواج، ادبیت اور شعر و شاعری سے اُنس، ملائمت، غیر مسلموں کے ساتھ غیر معمولی رواداری وغیرہ۔ ان خصوصیتوں نے اس سلسلے کی مقبولیت اور اشاعت میں بڑی مدد دی۔ نیز اس سلسلے کے بزرگوں نے مسلمانان پاک و ہند کی روحانی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔

وجہ تسمیہ

اس سلسلہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق شجرۃ الانوار میں لکھا ہے[4] کہ چشت نام کے دو مقام ہیں۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۴

[2] اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۴۵

[3] آب کوثر، ص ۲۸۹

[4] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۶ بحوالہ شجرۃ الانوار، موئف تاریخ مشائخ چشت کا کہنا ہے کہ شجرۃ الانوار

ایک خراسان میں ہرات کے قریب اور دوسرا پاکستان میں اوچ اور ملتان کے درمیان واقع ہے۔ خواجگانِ چشت خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں[۱] کہتے ہیں اس مقام پر کچھ بزرگانِ دین نے روحانی اصلاح و تربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا، جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بعدازاں وہ نظام اس مقام یعنی چشت کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔

بانیٔ سلسلہ

اس سلسلہ کا بانی کون تھا؟ اس بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف رہا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے بانی خواجہ احمد ابدال چشتی (متوفی ۳۵۵ھ) ہیں[۲]۔ اور بعض کے خیال میں خواجہ ابواسحاق شامی (متوفی ۳۲۹ھ)[۳]۔ لیکن چونکہ اول الذکر آخر الذکر کے خلیفہ تھے اس لئے دوسری بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ خواجہ ابواسحاق شامی سلسلہ چشتیہ کے سرخیل ہیں۔ چنانچہ تاریخ مشائخ چشت میں لکھا ہے[۴] کہ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی (متوفی ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء)

مولانا رحیم بخش خلیفہ حضرت فخرالدین دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس میں مشائخ چشت کے حالات بڑی تلاش اور محنت سے جمع کئے گئے ہیں۔ پیشِ نظر نسخہ میں جو قلمی ہے، سنہ کتابت ۱۲۸۱ درج ہے۔

[۱] مولانا سید علاء الدین اودھی جو سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنی تصنیف مامقیمان میں لکھتے ہیں کہ:

گر بہ ہندوستان شدیم چہ باک　　　سبزۂ گلشن خراسانیم

اس سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ سلسلہ چشتیہ کا تعلق خراسان والے چشت سے ہے، پاک و ہند والے چشت سے نہیں (دیکھیں مامقیمان، ص ۹۔ تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۶)

[۲] خواجہ احمد ابدال کا مزار چشت میں واقع ہے۔ (GLOSSARY VOL 1, P 528.)

[۳] خواجہ ابواسحاق شامی عام عقیدہ کے مطابق چشت میں مدفون ہیں لیکن درحقیقت ان کا مزار چشت میں نہیں بلکہ شام میں بمقام عکّہ واقع ہے۔ (GLOSSARY VOL 1, P 528.)

[۴] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۶۔ نیز دیکھیں عبدالقدوس گنگوہی ۶۴۔ غوث اعظم، ص ۸۹-۹۰

پہلے بزرگ ہیں جن کے اسم گرامی کے ساتھ تذکروں میں چشتی لکھا ہوا ملتا ہے۔ سیر الاولیا، مراۃ الاسرار، شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیا میں ان کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ ابو اسحاق شام کے رہنے والے تھے۔ اپنے وطن سے چل کر بغداد آئے اور حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری[1] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ دینوری (متوفی ۲۹۸ھ مطابق ۹۱۰ء) اپنے زمانے کے ممتاز بزرگ تھے۔ دور دور سے عقیدت مند ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان کا حال خواجہ فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیا[2] میں اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے نفحات الانس[3] میں بیان کیا ہے۔ خواجہ عطار کا بیان ہے[4] کہ وہ اپنی خانقاہ کا دروازہ عموماً بند رکھتے تھے۔ جب کوئی آتا تو پوچھتے کہ مسافر ہو یا مقیم۔ پھر فرماتے: اگر مقیم ہو تو اس خانقاہ میں آجاؤ۔ اگر مسافر ہو تو یہ خانقاہ تمہاری جگہ نہیں۔ کیونکہ جب تم چند روز یہاں رہو گے تو مجھے تم سے اُنس ہو جائے گا اور پھر تم جانا چاہو گے تو مجھے اس کی تکلیف ہوگی اور مجھ میں فراق کی طاقت نہیں ہے۔

جب خواجہ ابو اسحاق، خواجہ دینوری کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تو انھوں نے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کیا: ابو اسحاق شامی۔ فرمایا: آج سے لوگ تمھیں ابو اسحاق کہہ کر پکاریں گے اور چشت اور اس کے گرد و نواح کے لوگ تم سے ہدایت پائیں گے اور جو کوئی تمہارے سلسلۂ ارادت میں داخل ہوگا، قیامت تک اس کو چشتی کہہ کر پکاریں گے۔[5] اس کے بعد خواجہ دینوری نے

---

[1] دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ مشائخ چشت کے جو شجرے صوفیہ کے تذکروں میں درج کئے گئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علو دینوری اور شیخ ممشاد دینوری ایک ہی شخصیت ہے۔ اس لئے اس نام کو شیخ ممشاد علو دینوری بھی لکھتے ہیں۔ لیکن نفحات الانس اور بعض دوسری کتابوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ شیخ علو دینوری کوئی اور ہیں اور شیخ ممشاد دینوری کوئی اور۔ یعنی ان ناموں کا تعلق کسی ایک شخصیت سے نہیں بلکہ دو مختلف شخصیتوں سے ہے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۷ بحوالہ سفینۃ الاولیا: قلمی)

[2] تذکرۃ الاولیا، ص ۳۸۳ - ۳۸۴

[3] نفحات الانس (مطبوعہ بمبئی)، ص ۶۰ - ۶۲ - ۲۰۶ وغیرہ۔

[4] تذکرۃ الاولیا، ص ۳۸۳

[5] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۷ بحوالہ لطائف اشرفی (قلمی)، مراۃ الاسرار (قلمی)، شجرۃ الانوار (قلمی) نیز دیکھیں خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۲۴۰۔

ان کو رشد و ہدایت کے لئے چشت روانہ کر دیا۔ جہاں ان کی پر خلوص جد و جہد سے ایک عظیم الشان سلسلہ کی داغ بیل پڑی اور چشت بہت جلد ایک زبردست روحانی نظام کا مرکز بن گیا۔ خواجہ ابواسحاق فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ایک دن اپنے مرید خواجہ ابو احمد چشتی سے فرمانے لگے : اے ابو احمد! درویشی عرب اور عجم کی بادشاہی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر ابواسحاق کو ملک سلیمان بھی دیں تو خدا کی قسم وہ قبول نہیں کرے گا[1]

شجرۂ طریقت

صوفیائے کرام کے تمام سلسلے وصول الی اللہ کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا ربط آنحضرتؐ تک ثابت ہے[2]۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے سوا جو حضرت ابوبکرؓ کے ذریعے آنحضرتؐ تک پہنچتا ہے باقی سارے سلسلے حضرت علیؓ سے ہو کر آنحضرتؐ سے ملتے ہیں۔ چنانچہ سلسلہ چشتیہ بھی حضرت علیؓ کی وساطت سے آنحضرتؐ تک جاتا ہے۔

پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کا اجرا

کم و بیش تمام تذکرہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ سلسلہ چشتیہ کو پاک و ہند میں جاری کرنے کا شرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو حاصل ہے[3] گو اس میں شک نہیں کہ ان سے پہلے کچھ چشتی بزرگ یہاں تشریف لا چکے تھے۔ مثلاً خواجہ ابو محمد بن ابی احمد چشتی، جن کے متعلق مولانا جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے[4] کہ وہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ پاک و ہند میں تشریف لائے تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ کتاب ہذا کے آیندہ باب سے معلوم ہوگا۔ حضرت سخی سرورؒ

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۹ بحوالہ رسالہ احوال پیران چشت (قلمی)۔ نیز دیکھیں عبد القدوس گنگوہی، ص ۴۷

[2] دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۲۵۴۔ نیز دیکھیں غریب نواز، ص ۳۸

[3] بزم صوفیہ، ص ۳۵۔ تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۲۔ عبد القدوس گنگوہی، ص ۴۹-۵۰

[4] نفحات الانس، ص ۲۰۷

خواجہ مودود چشتی سے براہِ راست یہ سلسلہ لے کر یہاں آچکے تھے[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں سے یہ سلسلہ پھیل نہ سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا کوئی جانشین یا خلیفہ باقی نہ رہا۔ جہاں تک عقیدت مندوں یا عام مریدوں کی تعداد کا تعلق ہے اس کی تو کوئی حد نہیں لیکن ان سے سلسلہ آگے نہیں بڑھتا۔ سلسلہ کو پھیلانے والے، جیسا کہ خلیق احمد نے لکھا ہے[2]۔ صرف خلفا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدینؒ سے سلسلہ اس لئے جاری ہوگیا کہ ان کے خلفا موجود تھے اور پھر ان خلفا کے مزید خلفا ہوئے۔

حضرت خواجہ، حضرت سخی سرورؒ کے معاصر صوفیہ میں سے ہیں۔ لہٰذا ان کے مفصل حالات تو صوفیائے معاصر کے باب میں بیان کئے جائیں گے۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ وہ چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی میں پاک و ہند تشریف لائے اور کچھ عرصہ لاہور، ملتان اور پھر دہلی میں قیام کر کے اجمیر چلے گئے[3]۔ اس وقت پاک و ہند کے حالات نہایت ابتر تھے۔ اخلاقی قدریں بالکل گر چکی تھیں۔ ہر طرف بت پرستی کا زور تھا۔ انسانیت اونچ نیچ، ذات پات اور چھوت چھات میں بٹی ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے لوگوں کو بتایا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اس تفریق کو ختم کر کے انسانیت کو مساوات اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے[4]۔ ورودِ اجمیر کے بعد خواجہ صاحب سوائے ایک مرتبہ دہلی جانے کے کبھی اجمیر سے باہر نہ نکلے۔ وہیں یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ اور جو کوئی اخذِ فیض اور روحانی راہنمائی کے لئے آتا اس کی ہر طرح مدد کرتے۔ آخر ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء میں واصل الی اللہ ہوئے۔ مزارِ مقدس اجمیر میں واقع ہے اور تا حال زیارت گاہ خاص و عام ہے[5]۔ جس وقت خواجہ صاحب اجمیر میں وارد ہوئے، ہندوستان کا بادشاہ رائے پتھورا

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۶۔ معارج الولایت (قلمی: مجموعہ آذر)، ص ۵۲۹۔ (مجموعہ شیرانی، قلمی) ص ۴۱۸۔ تحقیقاتِ چشتی، ص ۱۹۹ وغیرہ

[2] تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۷۳۔ ۲۷۴

[3] آبِ کوثر، ص ۲۵۵

[4] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۳

[5] آبِ کوثر، ص ۲۳۲

وہیں رہتا تھا اور اجمیر راجپوت سامراج کا مضبوط مرکز اور ہندوؤں کا مذہبی گڑھ مانا جاتا تھا۔ دور دور سے ہندو اپنی مذہبی رسومات کو پورا کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب۔ اخبار الاخیار میں اجمیر کی مذہبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں[2] کہ ایک ایسے زبردست سیاسی اور مذہبی مرکز میں قیام کا فیصلہ نہ صرف خواجہ صاحب کے عزائم کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ان کی غیر معمولی خود اعتمادی کا بھی آئینہ دار ہے۔ میر خورد نے سیر الاولیا میں ان کو نائب رسول اللہ فی الہند کے لقب سے یاد کیا ہے[3]۔ مختصر یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا سلسلہ بقول شیخ اکرام[4] عنایت الٰہی سے اس طرح پھیلا کہ پاک و ہند کے تمام سلسلوں پر غالب آگیا۔

سلسلہ چشتیہ کی خصوصیات

قبل اس کے کہ ہم سلسلہ چشتیہ کی خصوصیات قلمبند کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسلامی پاک و ہند میں ایک سے زیادہ صوفی سلسلوں سے منسلک ہونے کا رواج رہا ہے بلکہ امام الہند شاہ ولی اللہ[5] نے تو یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں یعنی چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے بزرگوں کے نام لیتے تاکہ ان سب سے فیض حاصل ہو اور ان کی خصوصیات اخذ ہوں۔ ان رجحانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلسلوں کے ماننے والوں کے درمیان وہ حدّ فاصل نہیں رہی لیکن پھر بھی ان کے طریق ذکر و عبادت میں کئی امتیازات ہیں[6]۔
ایڈورڈ میکلیگن سلسلہ چشتیہ کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[7] کہ

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۲

[2] اخبار الاخیار، ص ۲۴

[3] سیر الاولیا، ص ۴۵

[4] آب کوثر، ص ۲۲۸ - ۲۲۹

[5] ہمعات (اردو ترجمہ)، ص ۴۴، تفصیل کے لئے دیکھیں انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ

[6] آب کوثر (ذیلی نوٹ)، ص ۲۹۰

[7] CENSUS REPORT FOR THE PUNJAB 1892 AD, P.193.

چشتیوں کے ہاں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت الا اللہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے بلکہ وہ عموماً ان الفاظ کو دہراتے وقت سر اور جسم کے بالائی حصہ کو ہلاتے ہیں۔ ان میں شیعہ حضرات کثرت سے ہیں۔ اس سلسلہ کی امتیازی خصوصیت سماع کا رواج ہے۔ حضرات چشت پر سماع کے وقت ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ لمبا اوقات اس سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ چشتی درویش بالعموم رنگ دار کپڑے پہنتے ہیں اور ان میں زیادہ تر ہلکے بادامی رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ شیخ اکرام[1] اور ابوالفیض قلندر علی سہروردی[2] نے بھی کم و بیش انہی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ محمد اجمل خان کا کہنا ہے[3] کہ اس سلسلہ میں ذکر الٰہی، ذکر جہر ذکر خفی (جو حبس دم کے ذریعہ بھی کیا جاتا ہے)، مراقبہ اور روزہ کے ذریعہ سے روحانیت میں ترقی کی جاتی ہے۔

سلسلہ میں بیعت کا طریقہ

اس ضمن میں ایچ۔ اے روز، ایڈورڈ مکلیگن اور سر ڈینزل ابٹسن کے حوالے سے لکھتے ہیں[4] کہ سب سے پہلے مرید دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔ پھر اسے چند ہدایتیں دی جاتی ہیں جنھیں وہ بلا چون و چرا جامۂ عمل پہناتا ہے۔ اس کے بعد اُسے سمجھایا جاتا ہے کہ (الف) فقیر کا کھانا پینا سب اللہ کے نام پر ہوتا ہے۔ (ب) اس کی زندگی یادِ الٰہی میں بسر ہوتی ہے۔ (ج) وہ موت کو ساتھ لے کر سوتا اور (د) کلمہ پڑھتے ہوئے نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ نیز مرید کو بتایا جاتا ہے کہ اب وہ فقیر بن گیا ہے۔ اسے چاہیے کہ مذکورہ ہدایات پر سختی سے عمل کرے۔ چونکہ لفظ فقیر چار حروف یعنی ف۔ ق۔ ی۔ ر سے مرکب ہے اور ف، فاقہ (روزہ)

۱ه آبِ کوثر، ص ۲۹۰-۲۹۱

۲ه الفقر فخری، ص ۷۸

۳ه غریب نواز، ص ۳۸

۴ه GLOSSARY, VOL 1, P 528-29.

ق، قناعت۔ ی، یادِ الٰہی۔ ر، ریاضت کی علامت ہے[1]۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ خود کو ان صفات سے متصف کرے۔ بعدازاں مرید سے کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ اپنی توجہ بیش از بیش اپنے مرشد یا روحانی راہنما کی طرف مبذول کرے۔ جب مرید کچھ دن یہ عمل کر لیتا ہے تو اسے چند مقدس کلمات بتائے جاتے ہیں اور حکم دیا جاتا ہے کہ وہ کسی مزار پر جا کر چالیس دن تک روزے رکھے۔ اصلاح میں مرید کے اس عمل کو "چلہ کشی" کہتے ہیں۔ چلّہ کے دوران مرید کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ ان مقدس کلمات کا ورد کرتا ہے جو اس کو بتائے جا چکے ہیں۔ جب مرید اس آزمائش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو سلسلہ میں بیعت کا حق مل جاتا ہے[2]۔ سلسلے میں شامل ہونے کے بعد مرید کی روحانیت روز بروز ترقی کرتی ہے۔ اور بفضل خدا اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چشم باطن کے ذریعہ عرشِ معلی بلکہ لوحِ محفوظ تک کی اشیا کا احاطہ کر سکتا ہے۔ ساری دنیا کو بیک نظر دیکھ سکتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ کائنات کے سربستہ راز اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ راز و نیاز کی رمزوں سے وہ بخوبی واقف ہو جاتا ہے اور اسم ذات کی حقیقت از خود اس پر عیاں ہو جاتی ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ

شیخ اکرام اپنی کتاب آبِ کوثر میں لکھتے ہیں[3] کہ سہروردیہ سلسلہ بھی چشتیہ سلسلہ کی طرح بہت پرانا ہے اور ٹھوس تبلیغی کاموں میں تو شاید اس کا پلہ چشتیہ سے بھاری ہے۔ کشمیر میں اسلام کبرویہ

---

[1] میر امن دہلوی نے بھی اپنی کتاب باغ و بہار میں فقیر کے متعلق انھیں خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: باغ و بہار محل مذکور۔

[2] شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ بیعت کے وقت صوفیہ کے تمام روحانی سلسلوں میں مرید کا سر تراشا جاتا ہے۔ اس سے توبہ کرائی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے لئے بیعت ایک نئی روحانی اور اخلاقی زندگی کا آغاز ہو۔ (ملاحظہ ہو آبِ کوثر، ص ۲۹۲)

[3] آبِ کوثر، ص ۲۹۰ - ۲۹۲

سلسلہ کے بزرگوں مثلاً امیر کبیر سید علی ہمدانی اور ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی نے پھیلایا جو سہروردیوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگال کے پہلے کامیاب مبلغ شیخ جلال الدین تبریزی تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اعظم تھے۔ اس وقت بنگال کی سب سے بڑی زیارتگاہ سلہٹ میں ایک سہروردی یعنی شاہ جلال یمنی کا مزار ہے۔ گجرات کے قدیمی دارالخلافہ میں حضرت سلطان المشائخ اور حضرت چراغ دہلوی نے بھی اپنے خلفا بھیجے لیکن دارالخلافہ یعنی شہر احمد آباد کی سب سے بڑی زیارتیں یعنی حضرتِ قطب عالم اور حضرت شاہ عالم کے سربفلک روضے سہروردی یادگاریں ہیں اور پاک پٹن سے مغرب کے علاقے یعنی سندھ اور بلوچستان کو تو بابا فرید بھی شیخ بہاالدین زکریا سہروردی کی ولایت کا جزو مانتے تھے۔[1]

وجہ تسمیہ

سلسلہ کی وجہ تسمیہ کی بابت سید صباح الدین نے بزم صوفیہ میں لکھا ہے[2] کہ سہروردیہ، چشت کی طرح ایک مقام کا نام ہے جو عراق وعجم کے اندر ہمدان اور زنجان کے درمیان واقع تھا۔ حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر[3]، ان کے پیر شیخ ضیا الدین ابو نجیب اور مؤخر الذکر کے پیر شیخ وجیہہ الدین یہیں کے رہنے والے تھے۔ اسی نسبت سے ان کے سلسلہ کو سہروردیہ کہتے ہیں۔

بانیٔ سلسلہ

چشتیہ سلسلہ کی طرح سہروردیہ سلسلہ کے بانی کے متعلق بھی تذکرہ نگاروں میں اختلاف

---

[1] سیر العارفین، ص ۱۱۵

[2] بزم صوفیہ، ص ۸۹ - نیز دیکھیں GLOSSARY VOL 1, P 544.

[3] شیخ شہاب الدین کی ولادت ۵۴۲ھ میں اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی - مزار اقدس بغداد میں ہے۔ (بزم صوفیہ ص ۸۹- .GLOSSARY VOL 1, P 544)، ملتان میں نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی تیسرے باب میں بیان کئے گئے ہیں۔ دیکھیں محل مذکور۔ (GLOSSARY VOL III, P 432.)

پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے بانی شیخ ضیاء الدین ابونجیب[1] اور بعض کے نزدیک شیخ شہاب الدین سہروردی[2] ہیں۔ شیخ اکرام نے آب کوثر میں بیان کیا ہے[3] کہ سہروردی سلسلہ کے بانی ابوالنجیب سہروردی تھے اور ان کے بھتیجے اور خلیفہ اکبر یعنی شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی اس سلسلہ کے بانی ثانی تھے۔ ہمارے خیال میں شیخ اکرام کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ جہاں تک سلسلہ کو قائم کرنے کا تعلق ہے اس لحاظ سے شیخ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی[4] کا نام سرفہرست ہے۔ لیکن اس سلسلہ کو فروغ دینے کی سعادت ان کے بھتیجے اور خلیفہ اکبر شیخ شہاب الدین سہروردی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ تاریخ مشائخ چشت میں لکھا ہے[5] کہ اس سلسلہ کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۴ء) ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ کی ترویج و اشاعت بڑی محنت سے کی تھی۔ اور اپنی کتاب

ھ۱ GLOSSARY, VOL 1, P 544.

ھ۲ بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۲۲۔ غریب نواز، ص ۳۹۔ - GLOSSARY, VOL 1 - P 544 - VOL III, P432.

ھ۳ آب کوثر، ص ۲۹۳۔ انوار حسین نے مولانا عبیداللہ سہروردی (متوفی ۱۸۸۶ء) پر جو مضمون لکھا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سہروردیہ سلسلہ کے بانی اول شیخ ابونجیب سہروردی تھے۔ (دیکھیں پاکستان ٹائمز بابت ۶۶-۶-۱۶)

ھ۴ آپ کا نام عبد القادر، ضیاء الدین، نجیب الدین القاب، سہرورد کے رہنے والے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ طیلسان اوڑھتے، عالموں کا لباس زیب تن کرتے، خچر پر سوار ہوتے اور لوگ آپ کا زین پوش تھامے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کے پاس آتے اور اکتساب فیض کرتے تھے۔ آپ کی صحبت سے بڑے بڑے لوگ نکلے۔ مثلاً شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ عبد اللہ بن مسعود رومی وغیرہ۔ تادم واپسیں آپ بغداد میں رہے۔ ۵۶۳ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے مدرسے میں جو دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا، دفن ہوئے۔ مزار اقدس بغداد میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

(طبقات الاولیا ترجمہ الطبقات الکبری، ص ۲۷۳-۷۴)

ھ۵ تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱-۱۳۲۔

عوارف المعارف[1] میں خانقاہی نظام کے متعلق پوری تفصیلات درج کر دی تھیں۔ پاک و ہند میں انھوں نے اپنے بہت سے مرید بھیجے تھے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا: خلفائی فی الھند کثیرۃ (یعنی ہندوستان میں میرے کافی خلیفہ ہیں)۔ شیخ نورالدین مبارک غزنوی، مولانا مجدالدین حاجی، شیخ ضیاالدین رومی، قاضی حمیدالدین ناگوری، حضرت سخی سرور ان کے مشہور خلفا تھے، لیکن جس بزرگ کو پاک و ہند میں سہروردیہ سلسلہ کو پھیلانے کا شرف حاصل ہوا وہ شیخ بہاالدین زکریا ملتانی ہیں۔ انھوں نے ملتان، اوچ اور دیگر مقامات پر سہروردیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کیں۔

سلسلۂ سہروردیہ پاک و ہند میں

صوفیائے پاک و ہند پر اب تک جتنے تذکرے[2] لکھے جا چکے ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کو یہاں لانے والے سب سے پہلے بزرگ شیخ بہاالدین زکریا ملتانی

---

[1] یہ کتاب تصوف کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں جب سلسلوں کی تنظیم شروع ہوئی تو سہروردیہ سلسلے کے علاوہ دیگر سلسلوں نے بھی اس کتاب کو اپنا لیا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تصوف کے بنیادی اعتقادات، خانقاہوں کی تنظیم، مریدین و شیوخ کے تعلقات اور دیگر مسائل پر نہایت وضاحت سے کتاب و سنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ تصوف کی اصطلاحات کے معنی مختصر لیکن جامع طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو تصوف کا پورا فلسفہ اس میں مدوّن ہو گیا ہے اور دوسری طرف خانقاہی نظام کے متعلق تفصیلی بحث آگئی ہے۔ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ بھی اس کتاب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ بابا فرید گنج شکر اپنے اعلیٰ مریدین و خلفا کو اس کا درس دیا کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۱۴-۱۱۵)۔ محمد عوفی کا بیان ہے کہ بابا فرید نے اس کتاب پر ایک حاشیہ بھی لکھا تھا۔ (دیکھیں گلزار ابرار قلمی)۔ شیخ شہاب الدین کی تصانیف میں عوارف المعارف کے علاوہ کشف النصائح الایمانیہ و کشف النصائح الیونانیہ اور بہجت الاسرار بھی بہت مشہور ہیں جن سے اب تک فیوض و برکات حاصل کئے جاتے ہیں۔ (بزم صوفیہ، ص ۸۹)

[2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: سفینۃ الاولیا، اذکار احرار۔ تذکرہ مشائخ کرام (فرشتہ)۔ بزم صوفیہ۔ خزینۃ الاصفیا وغیرہ۔

ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اکثر کتابوں[1] میں یہ بھی مرقوم ہے کہ حضرت سخی سرور نے براہِ راست شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اکتسابِ فیض کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ اس لحاظ سے اوّلیت کا شرف حضرت سخی سرور کو حاصل ہے۔ اس موضوع پہ آئندہ باب میں کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ البتہ یہ بات دوسری ہے کہ سلسلہ کو فروغ دینے والے پہلے بزرگ شیخ بہاأالدین زکریا ملتانی ہیں۔ غالباً اسی بنا پر ان کو پاک و ہند میں سلسلہ سہروردیہ کا موسسِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ شیخ بہاأالدین زکریا کے حالاتِ زندگی مفصل طور پر مختلف تذکروں میں درج ہیں[2]۔

سلسلۂ سہروردیہ کی خصوصیّات

اس سلسلے میں آبِ کوثر میں تحریر ہے[3] کہ چشتیوں اور سہروردیوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ اور اس امر کا بھی عام رواج تھا کہ ایک شخص بیک وقت دونوں سلسلوں کے بزرگوں سے فیض یاب ہو لیکن اگر ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو بہ نگہِ غائر دیکھیں تو ان کا امتیازی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ چشتیوں کی خصوصیات اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ سہروردی امورِ شرعی میں ان سے زیادہ محتاط تھے۔ ان کے ہاں سماع بہت کم تھا۔ خلافِ شرع امور پر وہ فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ دوسرے مذہبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی رواداری کا نہ تھا۔ تبلیغ کا جوش بھی ان میں زیادہ تھا۔ سیر و سفر کا شوق بھی انھیں چشتیوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ بالعموم چشتیوں کا رنگ جمالی تھا، سہروردیوں کا جلالی۔

---

[1] مثلاً دیکھیں: معارج الولایت (قلمی)۔ خزینۃ الاصفیا، تحقیقاتِ چشتی، آبِ کوثر، تذکرہ صوفیائے پنجاب، اور GLOSSARY, VOL 1. وغیرہ۔

[2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: فوائد الفواد، سیر العارفین، اخبار الاخیار، بزمِ صوفیاً، اسرار الاولیاً، تذکرہ مشائخ کرام (فرشتہ)، آبِ کوثر، انوارِ غوثیہ، بہاأالدین زکریا ملتانی وغیرہ۔

[3] آبِ کوثر، ص ۲۹۰-۲۹۱۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ دارالخلافہ کی نازک مزاج اور حساس ہستیوں کو سہروردی کسی بڑی حد تک مسخر نہ کر سکے لیکن اطراف ملک میں انھوں نے اسلام کا ڈنکا خوب بجایا اور اسلام کی بڑے پرجوش طریقے سے اشاعت کی۔

۳۔ سلسلۂ قادریہ

رود کوثر میں مرقوم ہے[1] کہ زمانِ وسطیٰ میں مرکزی حکومت کی کمزوری کا آخری زمانہ مذہبی انتشار کا زمانہ بھی تھا۔ لیکن سیاسی استحکام اور علوم اسلامی کی اشاعت کے ساتھ حالات سدھر گئے۔ اس اصلاحِ حالت میں ایک نئے صوفیانہ سلسلہ سے بھی مدد ملی، جس نے شمالی پاک و ہند بالخصوص پنجاب[2] اور سندھ میں بڑا اقتدار حاصل کیا۔ اور جس کا اثر آج کسی دوسرے خانوادے کے اثر سے کم نہیں۔ اس سلسلے کو عرفِ عام میں قادریہ سلسلہ کہتے ہیں۔ جس وقت یہ سلسلہ پاک و ہند میں آیا اس وقت چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کا زور کم ہو گیا تھا۔ گو ان خانوادوں میں سے اب بھی کئی پاک سیرت اور نیک نفس بزرگ پیدا ہو رہے تھے۔ جن کی زندگیاں عوام کے لئے چراغ ہدایت تھیں لیکن ان میں سلطان المشائخ جیسی عظیم الشان شخصیتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ مغلیہ حکومت کے استحکام کے بعد روز بروز اسلام کی جڑیں پاک و ہند میں زیادہ مضبوط ہو رہی تھیں اور اسلامی علوم اور فقہ کی اشاعت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے بعض متشرع بزرگوں کو جو تصوف اور ذاتی روحانی تجربات کو بھی اہمیت دیتے تھے ایک ایسے صوفیانہ نظام کی تلاش تھی جس کی کوئی بات شرع کی نظروں میں مشتبہ نہ ہو۔ بالآخر نقشبندیہ سلسلہ نے، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس ضرورت کو پورا کیا۔ لیکن اس کے فروغ سے پہلے اس بارے میں قادریہ سلسلہ کو دوسرے قدیمی سلسلوں پر امتیاز حاصل

---

[1] رود کوثر، ص ۵۷-۵۸

[2] اس بات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اہمیت اور تعداد کے لحاظ سے قادریوں کی زیارتیں پنجاب میں چشتیوں کے دوسرے نمبر پر ہیں۔ (دیکھیں GLOSSARY VOL III, P432.)

تھا۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے پرہیز گار علما مثلاً شیخ علی متقی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس سلسلہ میں بیعت کی اور اس سلسلہ کو خاص و عام میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

وجہ تسمیہ

یہ سلسلہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی طرح مقام کی نسبت سے نہیں بلکہ بانی سلسلہ کے نام کی نسبت سے قادریہ کہلاتا ہے۔ اگر اس کی نسبت مقام سے ہوتی تو اس کو جیلانیہ یا گیلانیہ کہتے کیونکہ بانیٔ سلسلہ جیلان یا گیلان کے رہنے والے تھے۔

بانیٔ سلسلہ

کم و بیش تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ سلسلہ قادریہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں۔ چنانچہ مؤلف تاریخ مشائخ چشت لکھتے ہیں[1] کہ آپ ہی سلسلہ قادریہ کے سرلشکر ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اصلاح و تربیت کا اعلیٰ انتظام قائم کر دیا تھا اور اپنے خلفا کو دور دور تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ آپ کے بعد اسلامی ممالک کے دور دراز حصّوں میں اس سلسلہ کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ آپ کے سوانح حیات کتاب ہذا کے تیسرے باب میں کسی قدر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ آپ ابو صالح موسیٰ کے فرزند ارجمند اور شیخ ابو سعید کے خلیفۂ اعظم تھے[2]۔

سلسلۂ قادریہ پاک و ہند میں

شیخ اکرام نے اپنی کتاب رودِ کوثر[3] میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے طریقہ قادریہ کے جس بزرگ کا

ے۱ تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱

ے۲ خزینۃ الاصفیا ج اول، ص ۹۴-۹۵۔ سفینۃ الاولیا، ص ۴۳-۵۸

ے۳ رودِ کوثر، ص ۵۷-۵۹

نام ملتا ہے وہ دکن کے شاہ نعمت اللہ قادری (متوفی ۱۴۳۰ء) تھے[1] لیکن ان سے سلسلہ بہت پھیلا نہیں۔ اور صحیح طور پر جس بزرگ نے پاک و ہند میں اس سلسلہ کا آغاز کیا وہ حضرت مخدوم محمد گیلانی قدس سرہٗ تھے۔ حضرت مخدوم محمد گیلانی کی وفات ۱۵۱۷ء میں ہوئی۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ سبھی اپنی جگہ پر بلند مرتبہ تھے لیکن جو مرتبہ مخدوم عبدالقادر ثانی کا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں ہوا۔ آپ کو شیخ عبدالقادر ثانی اس لئے کہتے ہیں کہ آپ کے کمالات حضرت غوث اعظم کے تابع تھے اور آپ روحانیت میں انھیں کے وارث حقیقی تھے۔ آپ کی بڑی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ آپ کی نگاہ میں ایسی تاثیر تھی کہ جس پر نظر ڈالتے اس کی کایا پلٹ جاتی۔ گنہگار ہوتا تو تائب ہو جاتا اور کافر ہوتا تو ایمان کی دولت سے شرف یاب ہوتا۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے[2] کہ بہت سے کفار آپ کے جمال و کمال کو دیکھ کر توبۃ النصوح کی سعادت کو پہنچے اور ایمان کی نعمت حاصل کرتے تھے۔

۴۔ سلسلۂ نقشبندیہ

پاک و ہند کے چار اہم سلسلوں میں سے ایک سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ باقی تین چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلے ہیں، جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے اور بھی کئی نام ہیں مثلاً سلسلۂ خواجگان[3]، سلسلۂ ذہبیہ[4] اور طریقۂ رسولیہ صدیقیہ[5] وغیرہ۔ قدامت

---

[1] اس بارے میں ہم شیخ اکرام سے متفق نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ کتاب ہذا کے اگلے باب سے معلوم ہوگا، حضرت سخی سرور (متوفی ۱۱۸۱ء بمطابق آبِ کوثر، ص ۹۲)، حضرت غوث اعظم سے براہِ راست باطنی تعلیم حاصل کر کے پاک و ہند میں تشریف لائے تھے۔ چنانچہ سلسلہ قادریہ کو یہاں پر لانے والے اوّلین بزرگ حضرت سخی سرور ہیں نہ کہ شاہ نعمت اللہ قادری۔ یہ دوسری بات ہے کہ سلسلہ کو فروغ نہ حضرت سخی سرور سے حاصل ہوا اور نہ شاہ نعمت اللہ قادری سے۔ بلکہ حضرت مخدوم محمد گیلانی اور ان کے خلفا نے اس سلسلہ کو پاک و ہند میں مقبول بنایا۔

[2] رودِ کوثر، ص ۶۱ بحوالہ اخبار الاخیار

[3] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۰

[4] برکات علی پور، ص ۱۰۶

[5] ایضاً

کے اعتبار سے اس سلسلے کو چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں پر فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں[1] کہ قدامت کے لحاظ سے سلسلۂ خواجگان سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ سلسلہ ترکستان میں قائم ہوا تھا۔ اس کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ خواجہ محمد اتا الیسوی (متوفی ۱۱۶۶ء) ہیں۔ ان کے بعد خواجہ عبدالخالق غجدوانی[2] (متوفی ۱۱۷۹ء) نے اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل اصطلاحات وضع کیں اور ان کو اپنے روحانی نظام کا لازمی جزو قرار دیا۔

ہوش در دم۔ نظر بر قدم۔ سفر در وطن۔ خلوت در انجمن۔ یاد کرد۔ بازگشت۔ نگاہ داشت یاد داشت۔

محمد اجمل خان نے غریب نواز[3] میں مذکورہ اصلاحات کے علاوہ تین اور اصطلاحات کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہیں: وقوف قلبی۔ وقوف زمانی۔ وقوف عددی۔ یہ اصطلاحات[4] حقیقت میں اصول ہیں اور ان کی تعداد کل گیارہ ہے۔ ان اصولوں کے ذریعہ سلسلۂ نقشبندیہ میں وصالِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔

خواجہ اتا اور خواجہ غجدوانی نے اس سلسلہ کو فروغ دینے کی بڑی کوششیں کیں لیکن اس کو مقبولِ عام بنانے کا شرف خواجہ بہاالدین نقشبند (متوفی ۱۳۸۸ء) کے لئے مقدر ہوچکا تھا جن کا ذکر آگے آئیگا۔ ان کے بعد یہ سلسلہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ خواجہ نقش بند نے اتباعِ سنت پر خاص زور دیا ہے۔

وجہ تسمیہ

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ سلسلہ خواجہ بہاالدین کے لقب نقشبند کی نسبت سے نقشبندیہ کہلاتا ہے۔ یعنی یہ چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی طرح مقام سے نسبت نہیں رکھتا بلکہ قادریہ سلسلہ کی طرح اس کا تعلق بانیٔ سلسلہ کے نام سے ہے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۰

[2] ان کے حالاتِ زندگی مولانا جامی نے بیان کئے ہیں۔ دیکھیں نفحات الانس ۲۴۲-۲۴۴۔

[3] غریب نواز، ص ۳۸

[4] ان اصطلاحات کی تفصیل کے لئے دیکھیں قول الجمیل مصنفہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی۔

بانیٔ سلسلہ

کم وبیش سب تذکرہ نگار متفق الرائے ہیں کہ پاک و ہند میں جو سلسلہ نقشبندیہ آیا ہے اس کے سرخیل خواجہ بہاءالدین نقشبند ہیں۔ خواجہ نقشبند کے حالات متعدد کتابوں میں درج ہیں[1]۔ برکات علی پور میں لکھا ہے کہ[2] آپ کا اسم شریف خواجہ بہاءالدین، لقب نقشبند، عرف مشکل کشا ہے۔ ساداتِ بخارا میں سے ہیں۔ آپ متبع سنت، مطیع شریعت بطریقِ اعلیٰ تھے۔ سلوک و تصوّف کو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ موافقت کرتے اور کراتے تھے۔ بدعاتِ سیئہ اور رسوم قبیحہ سے سخت متنفر تھے۔ ترکِ دنیا، قطع تعلق اہلِ دنیا، تجرد کلّی رکھتے۔ یادِ خدا، اور فکرِ حق میں ہر وقت مصروف رہتے۔ ایام سرما میں مسجد کے اندر گھاس اور گرمیوں میں بوریا بچھاتے۔ کھانے پینے کے وقت حلال طیب کے لئے بہت مبالغہ فرمایا کرتے۔ یہاں تک کہ شبہات سے بھی محترز رہتے۔ مہمان نوازی میں ایثار فرماتے۔ اگر کوئی ہدیہ یا تحفہ پیش کرتا تو رفع شکوک کے بعد ضرور قبول فرماتے۔ ہر معاملے میں بے تکلف رہتے۔ آپ پہلے تو کمخواب باف تھے پھر زراعت بھی کیا کرتے تھے۔ اپنا خاص مکان اور نوکر چاکر نہ رکھتے، بلکہ فرماتے کہ بندگی با خواجگی راست نمی آید[3]۔ اگر کوئی طعام بحالت غضب یا غفلت پکایا گیا ہو، اسے بھی نہ کھاتے اور فرماتے کہ جس حالت میں طعام تیار کیا جائے، اس حالت کا اثر اس میں ہوتا ہے۔ آپ کا جامہ اُونی۔ عمامہ سفید۔ پاپوش پرانا ہوتا۔ اور کبھی کلاہ بھی پہنا کرتے۔ درویشوں کی نہایت تعظیم کرتے۔ ہر ایک دوست کے ساتھ بتواضع پیش آتے۔ آپ قطبِ عالم تھے۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کو کہاں اور کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا: اتباع سنت سے۔ نیز فرمایا کہ جو شخص میرے طریقہ سے منہ پھیرے گا اس کو

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو نفحات الانس ص ۲۴۷-۵۰ ، رشحات (اردو ترجمہ) ص ۴۰، ۴۳

[2] برکات علی پور، ص ۵۵-۶۶ (اس کتاب میں نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں کا حال درج ہے اس کے مؤلف مولانا خیر شاہ حنفی نقشبندی مجددی ہیں)

[3] ایضاً ص ۶۰

دینی خطرہ ہے۔ طریقہ نقشبندیہ کا مخالف فوراً تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ بنائے طریقہ ما بر تتبع احادیث و آثار است[1]۔ یہی وجہ ہے کہ طریقہ نقشبندیہ کا نام طریقہ رسولیہ صدیقیہ مشہور ہے۔ خواجہ بہاؑ الدین نے بعض مشائخ ترک مثلاً حکیم خلیل اتا وغیرہ سے بھی فیض پایا تھا اور اس بنا پر آپ کے طریقہ میں جوش، شجاعت اور تصرّف زیادہ ہے۔ آپ اپنے وقت کے امام تھے۔

خواجہ عطّار کا کہنا ہے[2] کہ خواجہ نقشبند عالم پیری میں جس قدر مجاہدہ و ریاضت، ذکر و مراقبہ کیا کرتے تھے اس قدر تو ہم سے جوانی میں بھی نہ ہو سکا۔ آپ کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے گاؤں میں جو مسجد تعمیر کرائی تھی اس کے لئے اپنے سر پہ مٹی کی ٹوکری اٹھا کر لے جاتے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

بجان و دل کنم کار تو چرا نکنم   بسر و دیدہ کشم بار تو چرا نکشم

شجرۂ طریقت

یہ سلسلہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں کی طرح حضرت علی سے نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق سے ہو کر آنحضرت ص تک پہنچتا ہے۔

سلسلۂ نقشبندیہ کا پاک و ہند میں ورود

یہ سلسلہ پاک و ہند میں اس وقت پہنچا جبکہ مغلیہ حکومت کا دَور دورہ تھا۔ چنانچہ شیخ اکرام اپنی کتاب رودِ کوثر میں لکھتے ہیں[3] کہ مغلیہ حکومت کے استحکام کے بعد روز بروز اسلام کی جڑیں اس ملک میں زیادہ مضبوط ہو رہی تھیں۔ اور اسلامی علوم اور فقہ

---

[1] برکات علی پور، ص ۶۱۔

[2] برکات علی پور ص ۶۱، بحوالہ تذکرۃ الاولیا۔

[3] رودِ کوثر، ص ۵۸۔

کی اشاعت بڑھ گئی تھی۔ ایسے عالم میں بعض متشرع بزرگوں کو، جو تصوف اور ذاتی روحانی تجربات کو بھی اہمیت دیتے تھے، ایک ایسے صوفیانہ نظام کی تلاش تھی جس کی کوئی بات شرع کی نظر میں مشتبہ نہ ہو۔ بالآخر نقشبندیہ سلسلہ نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخِ چشت میں رقمطراز ہیں[1] کہ سلسلہ خواجگان گو سب سے زیادہ قدیم سلسلہ ہے لیکن پاک و ہند میں یہ سب سلسلوں کے بعد پہنچا۔ خواجہ باقی باللہ بیرنگ (متوفی ۱۶۰۳ء) اس کو یہاں لائے۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ "ایں تخم پاک را از سمرقند و بخارا آوردیم و در زمین برکت آگین ہند کشتیم"۔ خواجہ باقی باللہ کے عزیز مرید اور خلیفہ شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی (متوفی ۱۶۲۴ء) نے اس سلسلہ کو پاک و ہند میں ترقی دی۔ ان کے بعد یہ سلسلہ، سلسلۂ مجددیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

خواجہ باقی باللہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں پاک و ہند میں تشریف لائے تھے چنانچہ اس ضمن میں شیخ اکرام لکھتے ہیں[2] کہ اکبری عہد میں علماء و صلحاء کی کوئی کمی نہ تھی۔ بدایونی اور دوسرے مؤرخین نے ان کی جو طویل فہرستیں دی ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علمِ تصوف کا عہدِ زرین سمجھنا چاہیئے۔ لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہدِ اکبری کی مذہبی بوالعجبیوں کو روکنے کے لئے کوئی مؤثر کوشش نہیں کی۔ ان میں سے جو خالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے، مثلاً شیخ امان اللہ پانی پتی کے قبیلہ دار، وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریکِ کار ہو گئے۔ جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے، وہ زیادہ تر دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ تنہائی میں اللہ اللہ یا درس و تدریس کرنے لگے۔ دربارِ اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا، جو عہدِ اکبری کے بالکل آخر میں پاک و ہند آئے۔ انھیں یہاں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہ ہوا لیکن وہ نہ صرف روحانی پاکیزگی اور سربلندی میں بے نظیر تھے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱۔ [2] رودِ کوثر، ص ۱۸۷

بلکہ ان کا طریق کار وقت کی ضرورت کے لئے خاص طور پر موزوں تھا۔

عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہتے تھے چشتی سہروردی قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشہ تنہائی میں یاد خدا کرنے کی ہیں۔ لیکن اس وقت دربار شاہی سے بدعت و تجدد کی لہریں آرہی تھیں۔ اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا تاہم بعض درباریوں کے عقائد متزلزل ہو گئے تھے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ارباب فیض دربار شاہی اور اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے خاص طور پر ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشرتی بدعتوں نے پیدا کر دی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریق کار کے سب سے پُر زور ترجمان نقشبندی حضرات ہیں۔ جن کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانی نے کئی مکتوبات میں نقل کیا ہے۔ وہ قول یہ ہے: (ترجمہ) اگر ہم شیخی کرتے تو اس زمانے میں کوئی شیخ مرید حاصل نہ کر سکتا۔ لیکن ہمیں ایک اور مقصد کے لئے مامور کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو ظلم و ستم سے محفوظ رکھیں۔ اس کے لئے بادشاہوں سے اختلاط کرنا اور ان کے نفوس کو مسخر کرنا ضروری تھا تاکہ اس عمل سے مسلمانوں کی مقصد برآری ہو سکے[1]۔

پاک و ہند میں جس بزرگ نے اس اصول پر سب سے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف یہاں نقشبندی سلسلہ کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امرأ اکابر سے اختلاط پیدا کر کے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امرا کا محاذ قائم کیا، وہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگ تھے جنھیں خواجہ عباد اللہ احرار سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ انہوں نے سلسلۃ الاحرار کے نام سے جو رباعیاں لکھی ہیں ان میں ایک یہ ہے:

ایں سکہ کہ من زدم بنام فقر است — دین روشنی از نور تمام فقر است
برخیز د رہ خواجہ احرار بگیر! — کان راہ ز سر حد مقام فقر است

خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی کہیں بھی تفصیل سے جمع نہیں ہوتے۔ صوفیانہ کتب میں ضمنی طور پر جو کہیں اندراج مل جاتا ہے، اس سے آپ کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

[1] رودِ کوثر، ص ۱۸۸ بحوالہ مکتوبات امام ربانی

اور پتہ چلتا ہے کہ مختصر سے قیام کے اندر آپ نے اپنے لئے روحانی حلقوں میں کتنی بلند جگہ حاصل کر لی تھی۔ آپ کی ہمت اور کارشناسی کی داد دینی چاہیئے کہ اگرچہ آپ کو پاک و ہند میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہ ہوا اور اس مدت میں طبیعت نحیف ہی رہی لیکن اس قلیل عرصہ میں آپ نے نقشبندیہ سلسلہ کی بنیاد مستحکم طریقے پر اس ملک میں رکھ دی۔ آپ کو خوش قسمتی سے ایک تو مرید حضرت مجدد الف ثانی جیسا میسر آیا جس کے فیض سے اس سلسلہ کا مستحکم ہو جانا لازمی تھا لیکن ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا جن کے ذریعہ سے نہ صرف اس سلسلہ کی بقا کا سامان ہوا بلکہ اس ملک میں اسلام کو تقویت ہوئی اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی اس کا ازالہ ہوا۔[1]

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ خواجہ عبید اللہ احرار کا اصول تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کی بجائے ان سے ربط بڑھاتے اور انھیں مسخر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ باقی باللہ ہر رنگ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے اور جب وہ پاک و ہند میں تشریف لائے تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ دینِ الٰہی اور اکبر کے دوسرے احکام نے اگرچہ عام مسلمانوں کو متاثر نہیں کیا تھا تاہم اونچے حلقوں میں جو دربار سے قریب تھے خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لئے اس طبقہ کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ خواجہ صاحب نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔

خواجہ صاحب کے متعلق منتشر اور نامکمل اندراجات جو کچھ نظر سے گزرتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مند امرا میں بخشی الملک شیخ فرید خاں حاکم پنجاب، خان اعظم مرزا کوکہ، امیر الامراء مرزا عبد الرحیم خانخاناں سپہ سالارِ دکن، صدر جہاں، صدر الصدور اور ابوالفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل تھے۔ علما میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور حضرت مجدد الف ثانی تو ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اگر یہ بات دھیان میں رکھیں کہ یہی وہ مبارک ہستیاں تھیں جنھوں نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تو

---

[1] رود کوثر، ص ۱۹۲، ۱۹۳۔

حضرت باقی باللہ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان بزرگوں کے درمیان رشتۂ تسبیح کی حیثیت رکھتے تھے[1]

حضرت خواجہ باقی باللہ نے پاک وہند میں نقشبندیہ سلسلہ کی مضبوط بنیاد رکھی اور امرائے کے طبقہ میں مذہب سے وہ اُنس پیدا کر دیا جس کے سامنے اکبر کے مذہبی خیالات کا فروغ ناممکن تھا۔ لیکن انہیں بہت دن جینا نصیب نہ ہوا۔ ان کے کام کی کما حقہٗ تکمیل ان کے بلند اقبال اور بلند ہمت مرید حضرت مجدد الف ثانی[2] نے کی جنہوں نے ہوا کا رُخ ایک جانب سے بالکل دوسری سمت پھیر دیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی آمد سے پہلے جو صوفیانہ سلسلے پاک وہند میں برسرِ فروغ تھے وہ تمام کے تمام ایران اور ایران کی علمی سرحد، عراق کی پیداوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبد القادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ سہرورد سے متعلق تھا جو بغداد سے چند میل کے فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔ ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا اور ان سب میں وہ عجمیت جو دورِ عباسیہ کو دَورِ اموی سے اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین اور فقہائے سے منفرد کرتی ہے، موجود تھی تینوں میں وہ صلح کل کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے اخذ فیض کرنے سے اجتناب نہیں کیا جاتا تھا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریق رائج ہو گیا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ جس سلسلہ کو لے کر پاک وہند آئے وہ ایران کا نہیں بلکہ توران کا تحفہ تھا اور ماوراءالنہر کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلہ میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔ سماع کی ممانعت تھی۔ ذکر خفی کی تلقین تھی اور فرائض شرعی کو نوافل پر واضح ترجیح تھی۔

نقشبندیہ سلسلہ حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیہ سلسلوں سے ممتاز تھا۔ اور شرع سے بہت قریب تھا لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے سلسلوں سے مختلف نہ تھا جو فرق تھا وہ خواجگانِ بخارا و سمرقند کی آئین پسندی، ڈسپلن اور شرعی جوش و خروش

---

[1] خواجہ باقی باللہ کے حالات کی یہ تفصیل زیادہ تر رود کوثر، ص ۱۸۷ تا ۲۰۶ سے ماخوذ ہے۔

[2] حضرت مجدد اور دوسرے مشائخ نقشبندیہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو رود کوثر، ص ۲۰۹، ۳۴۳۔

کی وجہ سے تھا۔ اور ابھی تک کوئی ایسا صاحبِ فکر پیدا نہیں ہوا تھا جو نقشبندیوں کو ایک ایسا فلسفہ دے دیتا جو اس معاملے میں بھی انھیں ایک امتیازی رنگ دے کر ان کے خاص رجحانات کے لئے ایک فکری اساس کا کام دیتا۔ یہ کمی حضرت مجدّد نے پوری کر دی۔ ان کے ظہور سے پہلے تمام صوفیوں میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا۔ ابن العربی کا فلسفہ وحدت الوجود۔ بے شک اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے۔ بعض انتہا پسند صوفی تو وحدت الوجود میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ وہ قریب قریب دائرۂ اسلام سے باہر آجاتے ہیں۔ اور کئی دوسرے فقط اس حد تک اختیار کرتے ہیں جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک ایسا جداگانہ فلسفہ مدون ہوا جو فلسفہ وحدت الوجود کا مدمقابل ہو سکتا تھا۔ یہ فلسفۂ وحدت الشہود تھا جو معنوی لحاظ سے وحدت الوجود کی ضد یعنی تثنیۃ الوجود کا فلسفہ کہلا سکتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کا مسلک شروع میں وحدت الوجود کے قریب تھا اور گلزارِ ابرار میں لکھا ہے[1] کہ ان کے جانشین مرزا حسام الدین احمد نے اسے جاری رکھا۔ لیکن حضرت مجدد کا بیان ہے کہ آخری ایام میں انھوں نے یہ مسلک ترک کر دیا تھا۔[2]

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اور مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انھیں توحید علمی اور توحید ظلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک مشہور کتاب تذکرہ غوثیہ میں دونوں کا فرق اس طرح سمجھایا گیا ہے[3]: وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لئے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اس نورِ باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے۔ جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر

---

[1] رودِ کوثر، ص ۲۶۰، بحوالہ گلزارِ ابرار۔

[2] رودِ کوثر، ص ۲۶۱۔

[3] رودِ کوثر، ص ۲۶۱، ۲۶۲، بحوالہ تذکرہ غوثیہ۔

میں ہے، ان سب کی اصل وہی وصفِ باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں اور کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔

یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے۔ اور وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہورِ آثار وصفاتِ مختلفہ، واحد مطلق کی ذات وصفات کا ظلّ وعکس ہے، جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے اور یہ ظلّ عین صاحب ظلّ نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔ یہ دونوں نظریے دو مختلف بلکہ متضاد نفسیاتی رجحانات کے ترجمان ہیں [1]

نواب سر احمد حسین نے اپنی کتاب فلسفۂ فقراء میں دونوں فلسفوں کے فرق کو ایک نقشہ کی مدد سے نمایاں کیا ہے[2] جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

وحدت الوجود : (ھو الکل)	وحدت الشہود : (ھو الھادی)
نظریہ : ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست	نظریہ : ہمہ از اوست
رجحانِ تصوف : سکون کی طرف مائل	رجحانِ تصوف : جوش کی طرف مائل
مَیں اور وہ جدا نہیں (وہ دریا تو مَیں قطرہ ہوں)	اس کے ساتھ مَیں اور میرے ساتھ وہ ہے۔
وصل	عشق
اعتقاد: مَیں کون؟ انا الحق (عارف)	اعتقاد: مَیں کون؟ انا عبدہٗ (عاشق)

---

[1] امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی نے جو ہمارے سب سے زیادہ باریک بین اور معاملہ فہم عالم ہوئے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، اور اسمٰعیل آفندی کے نام ایک طویل عربی خط میں جواب مع اردو ترجمہ کے فیصلۂ وحدت الوجود والشہود کے نام سے شائع ہو چکا ہے، شیخ اکبر اور شیخ مجدد کے خیالات کی تطبیق کی ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رودِ کوثر، ص ۲۶۵)

[2] رودِ کوثر، ص ۲۶۲، ۲۶۳ بحوالہ فلسفہ فقرا۔

سلسلہ نقشبندیہ کی خصوصیات

نقشبندی درویشوں کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں لمبی لمبی چھڑیاں رکھتے ہیں۔ ان کے بال لمبے اور ہوا میں لہراتے ہیں۔ وہ منہ سے اونچی اونچی آوازیں نکالتے ہیں اور عام طور پر نوک دار اور تیز پتھروں پر چلتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے پاؤں چھلنی ہو جاتے ہیں اور وہ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑتے ہیں[۱]۔ نقشبندی درویشوں میں ٹوپی پہننے کا بھی رواج ہے۔ جو ہشت یا چہار گوشیہ ہوتی ہے۔ ٹوپی عموماً سفید اور کا مدار ہوتی ہے اور اس پر قرآن مجید کی کوئی آیت لکھی ہوتی ہے[۲]۔

یہ تھی ان چاروں سلسلوں کی سرگزشت جن کے پیروؤں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تصوف کی ترویج و اشاعت کی اور ہزاروں بندگانِ خدا کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر کے اسلام کا بول بالا کیا۔ لیکن یہ سلسلے جیسا کہ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے اسلامی تصوف اور اقبال میں لکھا ہے[۳] امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی مرکز یعنی اسلام سے ہٹتے گئے اور جس تصوف کا ماخذ اور منبع خود اسلام کا صاف شفاف چشمہ اور آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کی سیرت پاک تھی۔ اس سے ان طریقوں کے پیروؤں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر راہِ فرار اختیار کی۔ انھوں نے تصوف کو تصفیۂ قلب کی بجائے ذریعۂ معاش بنایا اور پیری مریدی کا بازار گرم کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعیف الاعتقاد عوام نے پیشہ ور پیروں کا شکار ہو کر اپنا متاعِ دین ہی کھو دیا اور ان حالات سے متاثر ہو کر بعض لوگ خود تصوف ہی سے بددل اور متنفر ہو گئے۔

۱۔ یہ خصوصیت عام طور پر ایران کے نقشبندی درویشوں سے تعلق رکھتی ہے، ملاحظہ ہو GLOSSARY, VOL I, P.549-50

۲۔ ایضاً P. 548, 49

۳۔ اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۱۴۵

تیسرا باب

حضرت سخی سرورؒ کا سلسلۂ طریقت

پچھلے باب میں صوفیائے عظام کے مختلف سلسلوں پر بحث کی جا چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری کتاب کے موضوع، حضرت سخی سرور کا تعلق ان میں سے کس کے ساتھ تھا۔ آپ کے حالات کسی تذکرہ یا کتاب میں تفصیلاً بیان نہیں ہوتے اور قدیم تذکرے تو ان سے بالکل خالی نظر آتے ہیں۔ تاہم جن تذکروں یا کتابوں[1] میں آپ کے سوانح حیات مختصر درج کئے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک سلسلہ کے پیرو نہیں تھے بلکہ بیک وقت تین سلسلوں سے مستفیض ہوئے تھے اور وہ تین سلسلے یہ ہیں: چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ۔ جہاں تک نقشبندیہ سلسلے کا تعلق ہے اس سے اکتساب فیض کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں سے فیض پانے کا تذکرہ بھی مختلف کتابوں میں مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔ یعنی کسی میں صرف یہ لکھا ہے کہ[2] آپ نے چشتیہ سلسلہ میں بیعت کی۔ کسی میں یہ درج ہے کہ[3] آپ سہروردیہ سلسلہ سے فیضیاب ہوئے۔ کہیں یہ مذکور ہے[4] کہ آپ نے چشتیہ اور سہروردیہ خانوادوں سے فیض حاصل کیا۔ کہیں

---

[1] مثال کے طور پر دیکھیں۔ خزینۃ الاصفیا۔ معارج الولایت (قلمی)۔ ہفت تماشای قتیل۔ تحقیقات چشتی۔ آب کوثر۔ چشمۂ کوثر۔ تذکرۂ صوفیائے پنجاب وغیرہ۔

[2] ہفت تماشای قتیل، ص ۸۹۔ دربار ملی، ص ۳۵۸۔

[3] الفقر فخری، ص ۷۲۔

[4] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی، قلمی) ص ۱۸ہ، ۱۹ہ۔ (مجموعہ آذر، قلمی) ص ۵۲۸، ۵۲۹۔ تحقیقات چشتی، ص ۱۹۹۔

بیان کیا گیا ہے کہ آپ[1] نے قادریہ اور سہروردیہ سلسلوں سے تعلق قائم کیا۔ کہیں یہ مرقوم ہے[2] کہ آپ نے تینوں سلسلوں میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

گو ہر کتاب میں ایک نئے سلسلہ سے ربط قائم کرنے کا ذکر ملتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ آپ کا ربط تینوں سلسلوں سے قائم ہوا تھا اور آپ نے ان سلسلوں کے روحانی پیشواؤں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔[3] چشتیہ سلسلہ میں آپ نے خواجہ مودود چشتی سے، سہروردیہ سلسلہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی سے اور قادریہ سلسلہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی سے۔ ان بزرگوں کی صحبت آپ کو بغداد میں میسر آئی تھی۔[4] بعض تذکروں اور کتابوں میں تحریر ہے[5] کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے تو آپ کی ملاقات بغداد میں ہوئی تھی لیکن خواجہ مودود سے تعلق چشت سے قائم ہوا تھا۔[6] بہرکیف ملاقات کسی طرح اور کہیں بھی ہوئی ہو، اتنا ضرور ہے کہ تینوں بزرگوں سے آپ نے فیض اٹھایا تھا۔

اب ہم ذرا فرداً فرداً تینوں بزرگوں کے حالات مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ قارئین حضرت سخی سرور کے روحانی رہنماؤں سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرلیں۔ چونکہ پاک و ہند میں زمانی اعتبار سے اولیت سلسلہ چشتیہ کو حاصل ہے اس لئے ہم پہلے خواجہ مودود چشتی کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔

۱۔ خواجہ مودود چشتیؒ

حضرت سخی سرورؒ نے خواجہ مودود چشتی سے بعض تذکروں کی رُو سے بغداد میں اور بعض

---

[1] عرس اور میلے، ص ۸۹۔ آبِ کوثر، ص ۹۱۔ چشمۂ کوثر، ص ۸۱۔

[2] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹ جلد دوم، ص ۲۴۶۔ تذکرۂ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۶،

GLOSSARY, VOL I, P 567 ، PANJAB AND ITS FEUDATORIES, P. 133

[3][4] ایضاً ایضاً

[5] خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۰۹ - ج ۲، ص ۲۴۶-

[6] ”

کی رُو سے چشت میں فیض پایا تھا۔ ان کے حالات مختلف کتابوں میں مرقوم ہیں۔ انوار اصفیا میں لکھا ہے[1] کہ خواجہ قطب الدین مودود چشتی، خاندانِ چشت کے اکابر میں سے تھے۔ ۴۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ مادر زاد ولی اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خواجہ ناصر الدین ابو یوسف[2] کے فرزندِ ارجمند تھے۔ شمع صوفیان وچراغِ چشتیان کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے بچپن ہی میں آپ سے خوارق اور کرامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ لوگ آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لگ گئے۔ تیس برس کے تھے تو والد ماجد دنیا سے رخصت ہوئے اور آپ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ والد سے جب بیعت ہوئے تو بیس برس تک گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور لوگوں کی نظروں سے چھپ کر عبادت، ریاضت اور مجاہدات میں لگے رہتے تھے۔ جب والد بزرگوار نے خرقہ خلافت عطا کیا تو فرمایا کہ مَیں تجھے کامل سمجھ کر یہ خرقہ عطا کرتا ہوں۔ والد ہی کی نظرِ عنایت سے اسرارِ حق آپ پر منکشف ہوئے۔

تعلیم کے سلسلے میں آپ بخارا بھی تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ المشائخ خواجہ نجم الدین عمر سے آپ نے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ بخارا کے علماء کے ساتھ آپ اکثر مباحثہ کرتے رہتے تھے۔ آپ نے علم ظاہری اور قوت باطنی سے ان سب کو مسخر کر رکھا تھا۔ اور ان میں سے کئی بڑے عالم آپ کے مرید تھے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک تھی۔ جو کوئی آپ کی صحبت اختیار کرتا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور باطنی کمالات حاصل کر کے جاتا۔ غرض تمام بڑے بڑے

---

[1] انوارِ اصفیا، ص ۱۱۲-۱۱۴

[2] خواجہ ابو یوسف چشتی، ابو محمد چشتی کے خواہر زادہ، مرید اور خلیفہ تھے۔ آپنے نے ۴۵۹ھ میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار چشت میں ہے۔ بڑے پایہ کے ولی اللہ تھے۔ کرامات وکمالاتِ باطنی سے مالا مال تھے ہمیشہ فقر و فاقہ کی حالت میں رہتے۔ بارہ سال تک ریاضت اور مجاہدہ کرتے رہے۔ دن رات میں کئی بار قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ بے حساب نذر و نیاز آتی مگر سب مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ (انوارِ اصفیا، ص ۱۱۲)

مشائخ آپ کی بہت زیادہ عزت وتکریم کرتے اور آپ کے عقیدت کیش تھے۔ شیخ احمد الغامقی الجامی قدس سرہٗ العزیز سے بھی آپ نے فیض پایا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب شیخ الاسلام احمد جامی، جام سے ہرات تشریف لائے تو دُور دُور تک آپ کے کمالات کی شہرت پہنچی۔ خواجہ صاحب کا ہر قول اور فعل شریعت کے عین مطابق ہوتا تھا، جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے، لوگ دل و جان سے اسے قبول کرتے۔ ریاضت اور عبادت کا یہ حال تھا کہ تیس سال تک مسلسل شب بیدار رہے۔ سالِ وفات ۵۲۷ھ ہے۔[1]

۲۔ شیخ شہاب الدین سہروردی

حضرت سخی سرور کے دوسرے روحانی رہنما شیخ الشیوخ، شیخ شہاب الدین سہروردی تھے جن سے آپ نے سلسلہ سہروردیہ میں اکتساب فیض کیا تھا۔ شیخ الشیوخ کے سوانح حیات متعدد تذکروں میں مرقوم ہیں۔ مولانا نور احمد خان فریدی سہروردی اپنی کتاب بہاؑ الدین زکریا ملتانی میں لکھتے ہیں[2] کہ شیخ الشیوخ اپنے چچا شیخ ابونجیب سہروردی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی فیض پایا تھا۔ حضرت غوث اعظم فرمایا کرتے تھے کہ اے عمرو! تم عراق کے آخری مشہور انسان ہو۔ آپ کو حضرت غوث اعظم سے جو عقیدت اور محبت تھی اس کا اندازہ آپ کی مشہور کتاب 'بہجۃ الاسرار' سے بخوبی ہو سکتا ہے جس میں حضرت غوث کے مناقب آپ نے اس محنت اور کوشش سے جمع کئے ہیں کہ کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ عوارف المعارف[3] اور اعلام الہدیٰ کے نام سے دو اور کتابیں بھی آپ نے لکھی ہیں جن کا پایہ تصوف کی دنیا میں بہت بلند ہے۔

شیخ رکن الدین علاؑ الدین ہمدانی فرماتے ہیں کہ احباب نے شیخ سعد الدین حمویہ سے پوچھا:

---

[1] انوار اصفیا، ص ۱۱۳

[2] بہاؑ الدین زکریا ملتانی، ص ۳۹-۴۶

[3] ایضاً، ص ۶۵

آپ نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو کیسا پایا؟ فرمایا: ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ پھر کہا: شیخ الشیوخ سے متعلق کیا رائے ہے؟ فرمایا: متابعت نبوی کا نور سہروردی کی پیشانی پر چمک رہا ہے۔

شیخ الشیوخ ہر سال بغداد سے حج کو روانہ ہوتے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر حج کرتے۔ پھر مدینہ منورہ جا کر روضہ مبارکہ کی زیارت سے مشرف ہوتے۔ اس کے بعد بغداد واپس تشریف لے آتے۔ عمر بھر آپ کا یہی دستور رہا۔

شیخ الشیوخ کے خلیفہ شیخ نجم الدین روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں شیخ کے پاس چلّہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شیخ ایک پہاڑ پر تشریف فرما ہیں، اور جواہرات کے بے شمار ٹکڑے آنجناب کے پاس پڑے ہیں۔ مخلوقات نے اس پہاڑ کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ حضرت مٹھیاں بھر بھر کر ان کی طرف پھینک رہے ہیں اور لوگ جھولیاں بھر بھر کر لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جواہرات کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ حضرت ان میں سے جس قدر خرچ کرتے ہیں، وہ اسی قدر زیادہ نظر آتے ہیں۔ جب میں خلوت سے باہر نکلا، تو چاہا کہ یہ واقعہ خدمتِ والا میں عرض کروں۔ ہنوز زبان تکلم آشنا نہ ہوئی تھی کہ حضرت نے فرمایا: تو نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ درست ہے اور یہ تمام برکت حضرت عبدالقادر جیلانی کی عنایت کا نتیجہ ہے۔[1]

حضرت غوث اعظم نے ۵۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ایک برس تک شیخ ابونجیب کو بغداد کی سیادت حاصل رہی۔ جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو پھر یہ مقام شیخ الشیوخ کو ملا۔ اب آپ اپنے زمانہ کے قطب اور بغداد کے شیخ الشیوخ تھے۔ اور قریب و بعید کے تمام اربابِ طریقت آپ ہی سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت غوث کی صحبت کا ایک عکس آپ پر یہ بھی پڑا تھا کہ آپ سماع نہیں سنتے تھے چنانچہ خزینۃ الاصفیا میں مرقوم ہے۔[2]

---

[1] بہاؤالدین زکریا ملتانی، ص ۴۱، ۴۲

[2] خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۱

ہر نعمتی کہ در بشر ممکن است شہاب الدینؒ دادہ اند الا ذوق سماع۔

کہتے ہیں کہ ایک رات شیخ اوحد الدین نے سماع کی درخواست کی۔ شیخ نے قوالوں کو طلب کیا، اور مجلسِ سماع ترتیب دے کر شیخ اوحد الدین کو لا بٹھایا اور خود ایک گوشہ میں بیٹھ کر قرآن تلاوت کرنے لگے۔ صبح کو خادم نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ مشائخ ساری رات سماع میں مشغول رہے۔ اب ان کے لئے ناشتہ درکار ہے۔ آپ نے تعجب سے فرمایا: کیا مشائخ تمام رات سماع سنتے رہے! یعنی آپ تلاوتِ قرآن میں اتنے مستغرق رہے کہ آپ کے کانوں میں سماع کی آواز تک نہ پہنچی۔

اس زمانے میں شیخ الشیوخ کی ذات دنیا بھر کے علمأ اور مشائخ کا ملجا و ماویٰ تھی۔ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی، شیخ نجیب الدین علی برغش، شیخ نورالدین غزنوی، شیخ ضیاالدین رومی، شیخ محمد یمنی۔ سید جلال تبریزی جیسے نامور اولیأ آٹھوں پہر زانوئے ادب تہ کئے حاضر رہتے تھے۔

اسی زمانے میں حضرت سخی سرور اور ان کے کچھ عرصہ بعد حضرت بہأ الدین زکریا بغداد میں داخل ہوئے اور شیخ الشیوخ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے[۱] آپ کی ولادت ۵۴۲ھ اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی[۲] مزار نور بار بغداد میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے[۳]

۳۔ غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت سخی سرور کے تیسرے بڑے مذہبی پیشوا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تھے جو صوفیا

---

[۱] بہأ الدین زکریا ملتانی، ص ۴۵۔

[۲] بہأ الدین زکریا ملتانی، ص ۴۶ بحوالہ مخبر الواصلین۔ بعض تذکروں میں شیخ الشیوخ کی تاریخ ولادت ۵۳۹ھ مرقوم ہے۔ مثلاً دیکھیں تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۲۴۰۔

[۳] بزم صوفیہ، ص ۸۹، (GLOSSARY VOL I, P544) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ الشیوخ کا مزار ملتان میں ہے (GLOSSARY VOL III, P37) لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔

میں غوث اعظم کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کے سوانح حیات متعدد کتابوں میں درج ہیں۔ انوار اصفیاء میں لکھا ہے[1] کہ آپ ایران کے ایک قصبہ گیلان میں ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے وقت والدہ ماجدہ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ والد ماجد سید ابو صالح موسیٰ کی طرف سے آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

سید محی الدین عبدالقادر جیلانی بن سید ابو صالح موسیٰ بن سید ابی عبداللہ بن سید یحییٰ زاہد بن سید محمد بن سید داؤد بن سید موسیٰ ثانی بن سید عبداللہ بن سید موسیٰ جون بن سید عبداللہ محض بن سید حسن مثنیٰ بن سید امام حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

اور والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ کی جانب سے نسب نامہ کی تفصیل یوں ہے:

ام الخیر فاطمہ بنت ابو عبداللہ صومعی بن ابو جمال بن سید محمد بن سید ابو طاہر بن سید عبداللہ بن ابو کمال بن سید موسیٰ بن سید ابو علاأ الدین بن سید محمد بن سید امام علی عریض بن امام جعفر صادق بن سید امام باقر بن سید امام زین العابدین بن سید امام حسین بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

مذکورہ نسب ناموں کے مطابق آپ حسنی و حسینی سید ہیں۔ حافظ وہبی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں[2]: کہ آپ نے فقہ قاضی ابو سعید مخزومی سے پڑھی اور حدیث ابو بکر بن مظفر، ابو غالب باقلانی، ابو قاسم بن بنان، ابو محمد جعفر سراج، ابو سعد بن جبیش اور ابو طالب بن یوسف سے۔ جب فارغ التحصیل ہوئے تو بہت سے علماء اور مشائخ نے آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ اور مختلف علوم مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کے شیوخ طریقت کا سلسلہ یہ ہے:

غوث پاک۔ شیخ ابو سعید مخزومی۔ حضرت ابو الحسن علی ہنکاری۔ حضرت ابو الفرح طرطوسی۔ شیخ عبدالواحد ابو الفضل۔ حضرت جنید ابو القاسم۔ شیخ ابو بکر شبلی۔ حضرت جنید بغدادی۔ حضرت سری سقطی، حضرت معروف کرخی، خواجہ حسن بصری۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

---

[1] انوار اصفیاء، ص ۱۱۵، ۱۳۱ [2] ایضاً، ص ۱۲۴، ۱۲۵

سلسلہ کا دوسرا طریقہ یوں ہے کہ حضرت معروف کرخی تک مشائخ عظام کی ترتیب وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، ان کے بعد اس طرح پر ہے: حضرت امام موسیٰ۔ پھر حضرت امام کاظم، پھر امام محمد باقر، پھر حضرت امام زین العابدین، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں فتوح الغیب اور غنیۃ الطالبین بہت مشہور ہیں۔ موخر الذکر کا اردو ترجمہ ہدیہ دستگیر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں مسائلِ فقہ، صوم وصلوٰۃ۔ حج وزکوٰۃ وغیرہ کا بیان ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد کی تشریح ہے اور اہل سنت کے عقائد کے مطابق ہر گمراہ فرقہ کی تردید کی گئی ہے۔ نیز بعض آیاتِ قرآنی کی تفسیر اور اعمال و اذکار و اشغال کا بیان ہے۔ پیری مریدی کے آداب حقوق العباد، آدابِ سماع اور ان تمام امور کا ذکر ہے جن کی سالک کو ضرورت پڑتی ہے گویا یہ کتاب شریعت اور طریقت کا لب لباب یا خلاصہ ہے۔ فتوح الغیب میں ترک و تجرید فنا و بقا، محب و محبوب اور امراض قلب و نفس کے علاج کا بیان ہے۔ یہ کتاب بھی طلبگارانِ سلوک کے لئے ایک نعمتِ عظمٰی ہے۔ آپ کے وعظوں کا ایک مجموعہ بھی موجود ہے جسے عفیف الدین ابن مبارک نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں ساٹھ مجلسوں کے وعظ فراہم کئے گئے ہیں۔ اس کو مجالسِ فیض اور فتح ربانی بھی کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں آپ کے بہت سے اشعار و قصائد ہیں جن میں قصیدہ غوثیہ بہت مشہور ہے۔ یہ قصیدہ مشائخ عظام میں بطور ایک شغل کے اکثر حاجتوں اور مرادوں کے لئے پڑھا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس میں عجیب و غریب تاثیرات رکھی ہیں۔[1]

وفات: حضرت غوث اعظم نے بعمر اکیانوے یا نوے برس، ربیع الآخر کی سترہ تاریخ کو ۵۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔ تاریخ میں بہت اختلاف ہے کسی نے نویں، کسی نے گیارھویں، کسی نے تیرھویں اور کسی نے سترھویں بیان کی ہے۔ مگر زیادہ روایتیں سترہ کی ہیں۔[2] روضہ مقدس بغداد میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔[3] تمام اسلامی ممالک میں ۱۱ ربیع الثانی کو آپ کے سالانہ

---

[1] انوار اصفیاء، ۱۳۶ [2] ایضاً، ص ۱۳۰
[3] غوث اعظم، ص ۸۱

عرس کا ختم دلایا جاتا ہے۔[1]

ذوقِ سماع: کہتے ہیں کہ حضرت غوث پاک کو سماع سے ذوق تھا۔ بہجۃ الاسرار میں اس سلسلے میں دو ایک باتیں بھی نقل کی گئی ہیں۔

اقوال: ارمان سرحدی نے احسن الکلام میں غوثِ اعظم کے بہت سے نادر اور قیمتی اقوال و ارشادات جمع کیے ہیں جن میں سے چند ایک تبرکاً یہاں درج کیے جاتے ہیں:[2]

— کوشش یہی کرنی چاہیے کہ اپنی بات جواباً ہو یعنی اپنی طرف سے کلام کی ابتدا نہ ہو۔

— کسی کے ساتھ نہ محبت کرنے میں جلدی کرو اور نہ عداوت کرنے میں عجلت سے کام لو۔

— جس طرح تمہارا نفس اللہ کا حکم ماننے سے انکار کرتا ہے اسی طرح تم اپنے نفس کا کہنا ماننے سے انکار کرو۔

— رحمت نہ مانگو بلکہ رحیم کو مانگو۔

— ہنسنے والوں کے ساتھ مت ہنسو مگر رونے والوں کے ساتھ روؤ۔

— قول صورت ہے اور عمل اس کی روح۔

— دولت مندوں کے ساتھ وقار اور غلبہ سے ملو اور درویشوں کے ساتھ عجز و انکسار سے پیش آؤ۔

— عمل عقائد کی دلیل ہوتا ہے اور ظاہر باطن کی علامت۔

— جو مخلوق کا ادب نہیں کرتا وہ خالق کا ادب کرنے کا دعویٰ نہ کرے اور جو اپنے نفس کو تعلیم نہیں دے سکتا وہ دوسروں کو تعلیم دینے کی سعی نہ کرے۔

— خدا کا تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو۔ ظاہری شریعت کے پابند رہو۔ سینے کو خواہشات سے محفوظ کر لو۔ نفس میں جوانمردی رکھو۔ خلقِ خدا کو آزار نہ دو۔ آدابِ درویشاں کو ملحوظ رکھو اور چھوٹوں کو نصیحت کرو۔

— جو بادشاہوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہتا ہے اس کا دل سخت اور وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ جو لڑکوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس میں ہنسی مذاق کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو عورتوں کے پاس اٹھتا

---

[1] غوثِ اعظم ص ۷۹

[2] انوار اصفیا، ص ۱۳۰، ۱۳۱ بحوالہ احسن الکلام

بیٹھتا ہے اس میں جہالت اور بُری خواہش بڑھ جاتی ہے ۔ جو فاسقوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتا ہے وہ گناہ کرنے میں دلیر ہو جاتا ہے ۔ اور توبہ کرنے کی توفیق نہیں رہتی جو عالموں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے وہ پرہیزگار بن جاتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے اور جو نیک لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس میں اطاعت الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔

کیا حضرت سخی سرور شیخ بہأ الدین زکریا کے مرید تھے ؟

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت سخی سرور نے شیخ بہأ الدین زکریا ملتانی سے بھی فیض پایا تھا ۔ چنانچہ معارج الولایت میں مرقوم ہے[1] کہ آپ بہأ الدین زکریا ملتانی کے مرید تھے اور اسی بنا پر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو کوئی آپ کے مزار کی زیارت کو جاتا ہے، پہلے شیخ بہأ الدین کے مزار کی زیارت کرتا ہے ۔ اس کے بعد آپ کے مزار اقدس پر حاضری دیتا ہے ۔ تحقیقاتِ چشتی میں تحریر ہے[2] کہ آپ نے حضرت بہأ الدین زکریا ملتانی سے بھی کسبِ فیض کیا تھا ۔ عرس اور میلے میں مذکور ہے[3] کہ آپ خطۂ ملتان کے اولیا و مشائخ میں سے ہیں اور شیخ الاسلام حضرت بہأ الدین زکریا ملتانی کے مرید اور خلیفہ تھے ۔ مذکورہ بالا تین کتابوں یعنی معارج الولایت، تحقیقاتِ چشتی، عرس اور میلے کے علاوہ باقی تمام کتابوں میں یہ مندرج ہے کہ حضرت سخی سرور نے سلسلہ سہروردیہ میں شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے عطیۂ خلافت پایا تھا ۔ ان تین کتابوں میں جو یہ بات لکھی گئی ہے کہ آپ نے شیخ بہأ الدین زکریا سے اکتساب فیض کیا تھا اس کی بنیاد غالباً ایک کتاب معلوم ہوتی ہے ۔ باقی دو کتابوں میں یکے بعد دیگرے اسی کتاب سے اس بات کو نقل کر دیا گیا ۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تحقیقاتِ چشتی میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں معارج الولایت سے استفادہ کیا گیا ہے

---

[1] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی قلمی) ص ۱۸ ۱۴ (مجموعہ آذر قلمی) ص ۵۲۸

[2] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰

[3] عرس اور میلے، ص ۸۸

اور ساتھ ہی اس استفادہ کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے[1]۔ البتہ عرس اور میلے میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ یہ بات کہاں سے نقل کی گئی ہے۔ اس کتاب کے ذیلی حوالوں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعض بیانات خزینۃ الاصفیا سے استفادہ کر کے لکھے گئے ہیں[2]۔ لیکن جہاں تک خزینۃ الاصفیا کا تعلق ہے، اس میں صاف طور پر یہ مرقوم ہے[3] کہ حضرت سخی سرور نے غوث اعظم عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ مودود چشتی سے باطنی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ آپ شیخ بہاأالدین زکریا ملتانی کے بھی مرید اور خلیفہ تھے۔

قیاس ہے کہ عرس اور میلے کے مؤلف نے بعض باتوں میں تو خزینۃ الاصفیا سے بلاواسطہ یا بالواسطہ استفادہ کیا ہے اور بعض میں معارج الولایت سے براہِ راست یا بذریعہ تحقیقات چشتی فیض اٹھایا ہے اور یہ بات کہ حضرت سخی سرور نے شیخ بہاأالدین زکریا سے بھی روحانی فیض حاصل کیا تھا، موخر الذکر دو کتابوں میں سے کسی ایک سے نقل کی ہے۔

اسی لحاظ سے حضرت سخی سرور کا شیخ بہاأالدین زکریا سے فیض حاصل کرنا اصل میں صرف ایک کتاب میں درج تھا اور وہ کتاب جیسا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، معارج الولایت ہے[4]۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں یہ بات کہاں سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں صرف اتنا مذکور ہے[5] کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سخی سرور، شیخ بہاأالدین زکریا کے مرید تھے۔ اس بات سے ذرا پہلے اس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے[6] کہ آپ نے خواجہ مودود چشتی سے باطنی فیض حاصل کیا تھا۔ گویا اس کتاب کی رو سے حضرت سخی سرور نے سلسلہ چشتیہ میں خواجہ مودود چشتی سے اور سلسلہ سہروردیہ میں شیخ بہاأالدین زکریا ملتانی سے روحانی فیض پایا تھا۔

---

[1] تحقیقات چشتی، ص ۲۰۰ [2] عرس اور میلے، ص ۸۸

[3] خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۹۰۱، ج ۲، ص ۲۴۶

[4] اس کتاب کے دو قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ایک کا تعلق مجموعہ شیرانی سے ہے اور دوسرے کا مجموعہ آذر سے۔

[5] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی قلمی) ص ۴۱۸، ۴۱۹۔ (مجموعہ آذر قلمی) ص ۵۲۸، ۵۲۹۔

[6] ایضاً

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت سخی سرور نے شیخ بہاؤالدین زکریا سے بھی استفادہ کیا تھا بلکہ آپ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں[1] کہ سلسلۂ سہروردیہ میں آپ کے روحانی راہنما شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی تھے، جن سے آپ نے بغداد میں اخذِ فیض کیا تھا۔ اور یہ ذکر اکثر کتب میں ملتا ہے۔ اس امر کے پیشِ نظر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت نے شیخ الشیوخ سے فیض پانے کے باوصف ان کے مرید شیخ بہاؤالدین سے کیسے استفادہ کیا؟ جبکہ شیخ بہاؤالدین نے بھی شیخ الشیوخ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ اس اعتبار سے حضرت سخی سرور اور شیخ بہاؤالدین دونوں آپس میں پیر بھائی کہلا سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے یہ بات بھی فرض کی جا سکتی ہے کہ حضرت سخی سرور نے شیخ الشیوخ کے علاوہ اپنے پیر بھائی شیخ بہاؤالدین زکریا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا دونوں بزرگوں کا زمانہ ایک ہے یا اس میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے؟

حضرت سخی سرور کی تاریخِ وفات اکثر کتابوں[2] میں ۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء اور بعض میں[3] ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء درج ہے۔ ان میں سے اگر کسی ایک تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات کہ آپ نے شیخ بہاؤالدین زکریا سے خلافت حاصل کی تھی، غلط ہو جاتی ہے کیونکہ شیخ کی تاریخِ ولادت جو عام طور پر تذکروں میں پائی جاتی ہے، ۵۷۸ھ مطابق ۱۱۸۲ء ہے[4] اس لحاظ سے شیخ بہاؤالدین زکریا ایک روایت کی رُو سے حضرت سخی سرور کی وفات

---

[1] کتاب ہذا، ص ۱۰۱

[2] خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۹۰۳ - ج دوم، ص ۲۴۸ - تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰ - آبِ کوثر، ص ۸۱ - تذکرۂ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸ - چشمہ کوثر، ص ۹۱

[3] GLOSSARY, VOL I, P567 PANJAB AND ITS FEUDATORIES, P133

[4] آبِ کوثر، ص ۲۹۳ -

کے ایک سال بعد، اور دوسری روایت کی رُو سے آٹھ سال بعد دنیا میں آئے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ حضرت سخی سرور شیخ بہأالدین زکریا کے مرید تھے، اس تحقیق کی روشنی میں بالکل بے بنیاد ہو جاتا ہے۔

بزمِ صوفیا میں[۱] سفینۃ الاولیاءؒ کے حوالے سے شیخ بہأالدین زکریا کا سالِ ولادت ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۶۹ء درج ہے۔ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو ان کی ولادت حضرت سخی سرور کی وفات سے، ایک روایت کے مطابق پانچ سال قبل، اور دوسری روایت کے مطابق بارہ سال قبل ہو چکی تھی۔ گویا حضرت سخی سرور کی وفات سے پہلے شیخ بہأالدین زکریا کی عمر پانچ سال تھی، یا بارہ سال۔ اگر پانچ سال کو صحیح تسلیم کر لیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، کہ حضرت سخی سرور نے شیخ بہأالدین زکریا سے ان کے بچپن میں خلافت حاصل کی تھی۔ اگر بارہ سال کو درست مان لیں، تب بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کم سنی میں انھوں نے بغداد جا کر شیخ الشیوخ سے خلافت حاصل کی، اور پھر حضرت سخی سرور کو اپنا خلیفہ بنایا۔

مختصر یہ کہ ہر اعتبار سے یہ بات غلط ہے کہ حضرت سخی سرور نے شیخ بہأالدین زکریا ملتانی سے سہروردی سلسلہ میں اکتسابِ فیض کیا تھا۔ چنانچہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کے روحانی پیشوا شیخ الشیوخ تھے، جن سے آپ نے بغداد میں باطنی تعلیم حاصل کی تھی۔

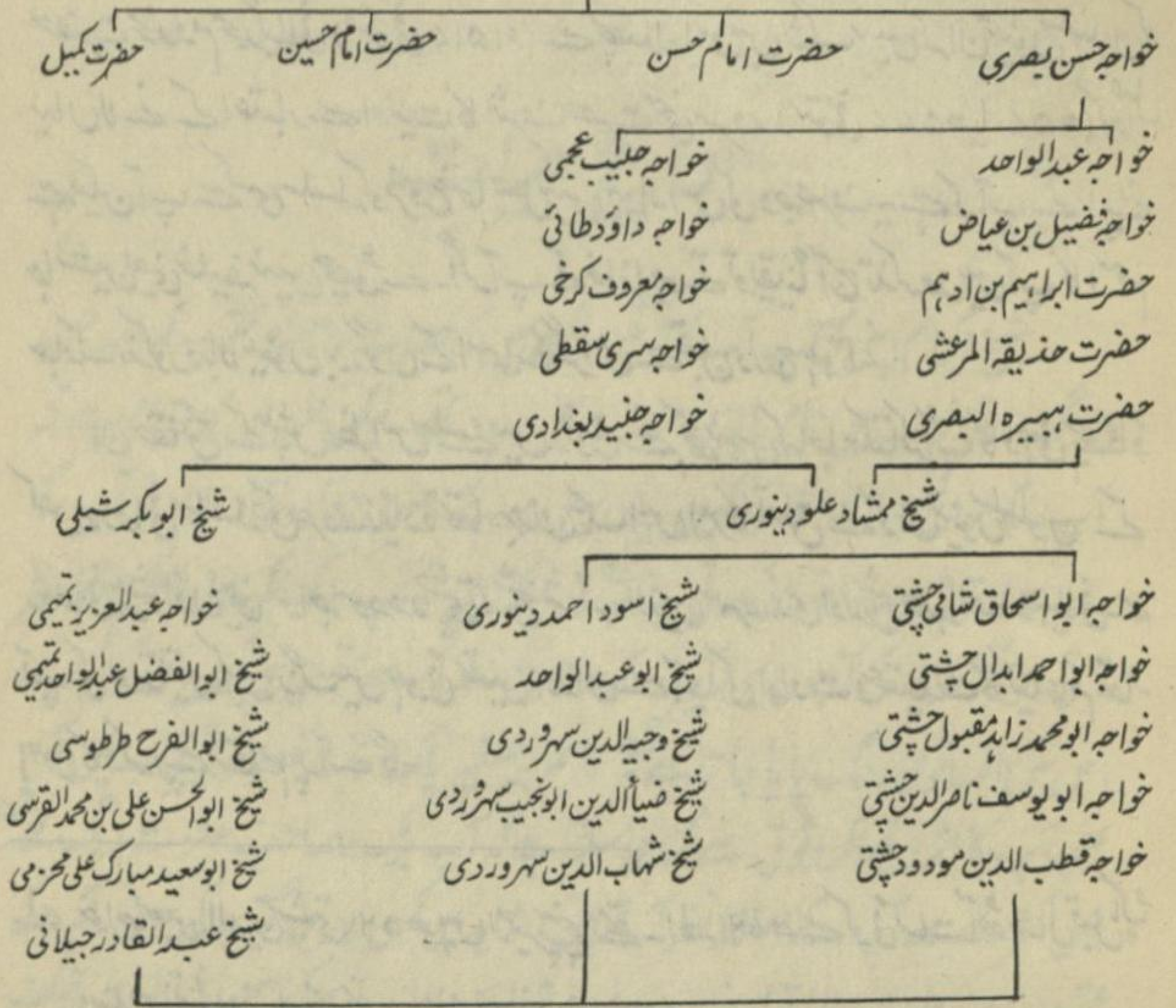
خواجہ مودود چشتی، شیخ شہاب الدین سہروردی، اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے حضرت سخی سرور نے جو روحانی فیض اٹھایا اس کی رُو سے آپ کا شجرۂ طریقت یوں مرتب ہوتا ہے:

---

[۱] بزمِ صوفیاءؒ، ص ۱۰۴، بحوالہ سفینۃ الاولیاءؒ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ



ذہنی رجحان کس سلسلہ کی طرف زیادہ تھا؟

اب سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت سخی سرور کا ذہنی رجحان یا طبعی میلان ان تینوں سلسلوں میں سے کس کی جانب زیادہ تھا؟ اس باب میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ تینوں خانوادوں کو یکساں جانتے تھے اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ کے حالاتِ زندگی جو کچھ کتابوں میں مذکور ہیں، ان کے مطالعہ سے کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ آپ نے چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں میں سے کسی ایک کی ترویج اور اشاعت میں حصہ لیا ہو۔

چنانچہ کتابوں میں یہی مرقوم ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں چشتیہ سلسلہ خواجہ معین الدین[۱] اجمیری (متوفی ۶۳۲ھ) سے، سہروردیہ، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی (متوفی ۶۶۵ھ) سے، قادریہ، حضرت مخدوم محمد گیلانی (متوفی ۱۵۱۷ء) سے پھیلا۔ اس میں شک نہیں کہ ان تینوں سلسلوں کو یہاں لانے کے اعتبار سے اولیت کا شرف حضرت سخی سرور (متوفی ۵۷۷ھ یا ۵۷۰ھ) کو حاصل ہے لیکن آپ سے کسی سلسلہ کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے اپنے جانشین یعنی خلیفہ نہیں چھوڑے۔ اگر آپ کے خلفا ہوتے تو یقیناً آج تذکروں میں آپ کا اسم مبارک مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کے اسمائے گرامی سے قبل درج ہوتا۔

ان حقائق کے پیشِ نظر اس سلسلے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا ذہنی جھکاؤ کس روحانی سلسلہ کی طرف زیادہ تھا۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ان تینوں سلسلوں کے روحانی پیشواؤں یعنی خواجہ مودود چشتی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے آپ کی ملاقاتیں کس رنگ میں ہوئی تھیں اور ان سے آپ کی ارادت و عقیدت کا کیا عالم تھا۔ اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

---

[۱] خواجہ معین الدین چشتی ۵۶۱ھ میں اجمیر پہنچے تھے۔ اور ۵۶۱ھ سے کوئی سات آٹھ سال قبل پاک و ہند میں تشریف لائے تھے۔ (بزمِ صوفیاء، ص ۳۳)
اس اعتبار سے آپ حضرت سخی سرور کے معاصر صوفیہ میں سے ہیں، تاہم چشتیہ سلسلہ کے مشائخ کی ترتیب اور حضرت سخی سرور کے سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سخی سرور، خواجہ اجمیری سے قبل سلسلہ چشتیہ کو یہاں لائے تھے۔

چوتھا باب

سوانح حیات

شیخ اکرام اپنی کتاب آب کوثر[1] میں لکھتے ہیں کہ حضرت داتا گنج بخش کے بعد جس بزرگ نے پنجاب میں نام پایا وہ حضرت سخی سرور تھے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آپ کے سوانح حیات مفصلاً کہیں بیان نہیں ہوئے۔ صوفی تذکرہ نگاروں نے آپ کے بارے میں بڑی بے اعتنائی برتی ہے۔[2] قدیم کتابیں تو آپ کے ذکر سے بالکل معرّیٰ نظر آتی ہیں۔[3] مابعد کی کتابوں میں آپ کے حالاتِ زندگی سے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس میں افسانوی رنگ پایا جاتا ہے۔[4] تاہم برصغیر پاک و ہند خصوصاً پنجاب میں آج بھی آپ کا اثر دیکھ کر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ بڑے صاحبِ سطوت بزرگ تھے۔[5] جس کثرت سے آپ کے معتقد نظر آتے ہیں، شاید ہی کسی اور بزرگ کے ہوں۔ آپ کے عقیدت مندوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت مسلمان، ہندو، سکھ سبھی شامل ہیں مختلف تذکروں اور کتابوں کے مطالعہ سے آپ کے حالات و کوائف کی بابت جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے، اسے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱ے آب کوثر، ص ۹۱ - نیز دیکھیں چشمۂ کوثر، ص ۸۱

۲ے ایضاً، ص ۹۲ - ایضاً، ص ۸۲

۳ے تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸

۴ے GLOSSARY, VOL 1, P 566. 'PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132

۵ے آب کوثر، ص ۹۲ - چشمۂ کوثر، ص ۸۲

آباؤ اجداد

کم وبیش تمام کتابوں میں مرقوم ہے کہ حضرت سخی سرور کے آبا و اجداد عرب کے رہنے والے تھے۔[1]

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۱۔ ج دوم، ص ۲۴۶۔ تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰۔ حضرت سخی سرور کے آبا و اجداد کا مفصل حال کہیں مذکور نہیں ہے۔ ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے ضلع ڈیرہ غازیخاں سے آپ کے سوانح حیات پر جو چند صفحوں کا کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس میں آپ کے آبا و اجداد کے متعلق کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہم انھیں بر سبیل تذکرہ یہاں درج کرتے ہیں۔ کتابچہ میں لکھا ہے کہ امام موسیٰ کاظم کے دو فرزند تھے۔ ایک کا نام موسیٰ علی رضا اور دوسرے کا سید اسمٰعیل تھا، جس کو ابراہیم بھی کہتے ہیں۔ کئی برس تک امام موسیٰ علی رضا خلافت فرماتے رہے اور وعظ و نصیحت سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ رحلت سے قبل چھوٹے بھائی سید اسمٰعیل کو انھوں نے اپنے پاس بلاکر کہا کہ میرا بیٹا محمد تقی خورد سالہ ہے۔ دستار بندی اور خلافت کے قابل نہیں۔ سردست آپ امورِ خلافت کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے بعد آپ معبودِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ بعدازاں کئی سال تک سید اسمٰعیل خلافت پر مامور رہے۔ جب محمد تقی سنِ بلوغ کو پہنچے تو سید اسمٰعیل نے خلافت واپس کردی اور کہا کہ اب تم تبلیغِ اسلام کرو اور شرع کی پابندی کا خیال رکھو۔ یہ کہہ کر آپ بغداد تشریف لے گئے۔ اہل بغداد کو معلوم ہوا تو جوق در جوق آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور فیض الٰہی سے مستفیض کیا۔ بادشاہِ بغداد نے اپنی دختر نیک اختر کی شادی آپ سے کردی۔ اس نیک بخت عورت کے بطن سے خدا نے آپ کو تین فرزند عنایت کیے۔ جن میں ایک کا نام سید احمد، دوسرے کا سید شجاع اور تیسرے کا سید قتال تھا۔ کچھ عرصہ بعد صاحب موصوف دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ آپ کا مقبرہ بغداد میں ہے۔ آپ کے بعد جانشین سیّد شجاع ہوئے۔ کئی برس تک وہ مسندِ خلافت پر متمکن رہے، پھر بغداد سے حج کی نیت سے روانہ ہوئے۔ کوئی اٹھائیس انتیس برس تک خانۂ کعبہ میں عبادت میں مصروف رہے اور تبلیغ اسلام و اشاعت شرع سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ آپ نے ایک یونانی سوداگر کی لڑکی سے نکاح کیا۔ اس نیک سیرت بیوی سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایک کا نام سیّد عبداللطیف اور دوسرے کا سیّد مراد شاہ تھا۔ آخر سید شجاع کا بھی وصال

اور سب سے پہلے آپ کے والد ماجد حضرت زین العابدین بغداد[ا] سے برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے۔ اور ملتان کے متصل کوئی گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں سکونت

ہوا۔ ان کا مقبرہ کعبہ شریف کے صحن میں بتایا گیا۔ ان کے بعد سجادہ نشین سید عبداللطیف ہوئے۔ کچھ عرصے بعد انھیں سرورِ کائنات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے بحکم رسول کریم ایک صحابی کی لڑکی سے نکاح کیا۔ اس خاتون سے پروردگار نے دو بیٹے عطا فرمائے۔ ایک کا نام سید عمر شاہ اور دوسرے کا سید مراد شاہ تھا۔ آخر ان کا بھی انتقال ہوا۔ ان کا مزار مدینہ منورہ میں ہے۔ ان کے بعد سید عمر شاہ گدی نشین ہوئے۔ وہ متواتر بیالیس سال تک آنحضرتؐ کے روضۂ اقدس کی خدمت کرتے رہے اور پند و موعظت سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ صاحب موصوف نے بھی ایک صحابی کی لڑکی سے شادی کی جس سے چار فرزند پیدا ہوئے۔ ایک کا نام سید زین العابدین، دوسرے کا سید حسن، تیسرے کا سید علی اور چوتھے کا سید جعفر تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب سید عمر شاہ کا انتقال ہوا تو سید زین العابدین مسند خلافت پر بیٹھے۔ وہ بائیس سال تک آنحضرتؐ کے روضہ مبارک کی خدمت کرتے رہے۔ ایک رات بحالت خواب انھوں نے آنحضرتؐ کی زیارت فرمائی۔ آپؐ کے حکم سے پاک و ہند میں تشریف لائے اور ملتان کے قریب شاہکوٹ میں توطن اختیار کیا۔ (ملاحظہ ہو: سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۷-۹)

حضرت سخی سرور کے آبا و اجداد سے متعلق جو تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں۔ ان کی تصدیق کسی ماخذ سے نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ "سوانح حیات" میں یہ واقعات سنی سنائی باتوں کی بنا پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً ان کا کچھ نہ کچھ سراغ ہمیں کسی نہ کسی تذکرہ یا کتاب میں ملتا۔ لیکن تلاش و جستجو کے باوجود ہماری نظر سے ایسی کوئی کتاب نہیں گزری جن سے مذکورہ بالا واقعات کی تائید و تصدیق ہو سکتی۔ بہرکیف ان واقعات کو رد کرنے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔

[ا] منشی حکم چند کا بیان ہے کہ حضرت زین العابدین بخارا سے تشریف لائے تھے۔ (تواریخ ملتان ص ۹۰) لیکن کسی کتاب سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔

خلیفارئی؁ جو آج کل شاہکوٹ؁ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت زین العابدین یہاں کب اور کیوں

؁ LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL II, P 118.

؁ GAZETTEER OF MULTAN, P 141. - اس گاؤں کا نام مختلف کتابوں میں مختلف صورتوں میں درج ہے۔ مثلاً کہرسی کوٹ (تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰)، کہرسکوٹ (تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰) کرسی کوٹ (خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹، ج دوم، ص ۲۴۶)، شہ کوٹ (تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۴۴)، شاہکوٹ یا شاہ کوٹ (LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P 306.)

آخری نام یعنی شاہ کوٹ سے بعض تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حضرت زین العابدین، ضلع جھنگ میں واقع شاہ کوٹ میں اقامت پذیر ہوئے تھے، جو ۱۸۹۲ء کے بعد ضلع گوجرانوالہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ دیکھیں: (PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 133.) - حقیقت یہ ہے کہ گاؤں کا اصل نام سہ کوٹ ہے جو غلطی سے شہ کوٹ، شاہکوٹ اور دوسرے ناموں سے مشہور ہو گیا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق منشی حکم چند لکھتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں تین کوٹ (گاؤں) ہوتے تھے۔ لیکن گھنوخان، حاکم ملتان نے جو حضرت سخی سرور کے خسر بھی بتائے جاتے ہیں، تینوں کوٹ جلا دیئے۔ ان کا نشان اب تک موجود ہے۔ چونکہ فارسی زبان میں تین کو سہ بولتے ہیں اس لئے اس گاؤں کو سہ کوٹ کہتے تھے (تواریخ ملتان، ص ۹۱)۔ منشی حکم چند کے اس بیان کی تصدیق مرقع ملتان سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اصل میں لفظ سہ کوٹ ہے لیکن کچھ عرصہ بعد شکوٹ، شہ کوٹ یا شاہ کوٹ مشہور ہو گیا۔ اسی کتاب میں ذرا آگے چل کر مذکور ہے کہ حضرت زین العابدین کا مزار سہ کوٹ میں واقع ہے اور مزار کے گرد و نواح میں تین قدیم آبادیوں کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً انہی آبادیوں کو سہ کوٹ کہتے تھے۔ یہ آبادیاں حوادث زمانہ کا شکار ہو کر تباہ ہو گئیں لیکن ان کے کھنڈرات میں سے اب بھی بارش یا کھدائی وغیرہ کے ذریعہ پرانے سکّے یا دوسری اشیا برآمد ہوتی رہتی ہیں جن سے ان آبادیوں کا پتا چلتا ہے۔ (مرقع ملتان، ص ۲۲۲-۲۲۳)۔ گزیٹیر ڈیرہ غازی خاں میں لکھا ہے کہ حضرت زین العابدین سیالکوٹ میں اقامت پذیر ہوئے تھے۔

آئے ؟ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے - ایچ - اے روز[1] اور ایڈورڈ مکلیگن[2] نے ان کا سال ورود ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء بتایا ہے - ڈیرہ غازیخاں کے سرکاری گزیٹیر[3] میں لکھا ہے کہ وہ ۶۵۰ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں یہاں تشریف لائے تھے - ہمارے خیال میں ایچ اے روز اور ایڈورڈ مکلیگن نے ان کے یہاں آنے کا جو سال بتایا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے - کیونکہ حضرت سخی سرور کا سال وفات، جس پر کم وبیش تمام تذکرہ نگار متفق ہیں، ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء[4] یا ۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء ہے[5] - ظاہر ہے کہ حضرت زین العابدین اپنے بیٹے حضرت سخی سرور کی وفات سے پہلے یہاں تشریف لائے ہوں گے - اگر ہم گزیٹر ڈیرہ غازیخاں کی مرقومہ تاریخ کو صحیح مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت زین العابدین اپنے بیٹے کی وفات کے بعد یہاں آئے تھے - چونکہ ایسا ممکن نہیں اس لئے ایچ اے روز اور ایڈورڈ مکلیگن کی رائے درست اور صحیح ہے -

---

لیکن اسی گزیٹیر میں یہ بات بھی مندرج ہے کہ سیالکوٹ، ملتان سے کوئی بارہ میل فاصلے پر واقع ہے (ملاحظہ ہو CENSUS REPORT OF DERAGHAZI KHAN - 1961, P 1-21 - اور GAZETTEER OF DERAGHAZI KHAN, P 51. قیاس چاہتا ہے کہ شاہ کوٹ کو سیالکوٹ سمجھ لیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے -

ے۱ GLOSSARY, VOL 1, P 567.

ے۲ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 133.

ے۳ GAZETTEER OF DERAGHAZI KHAN, P 51.

ے۴ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 133.

LEGEND OF THE PUNJAB, VOL III, P 301.

GLOSSARY, VOL 1, P 567

ے۵ خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۳ - ج دوم، ص ۲۴۸ - تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸ -

حضرت زین العابدین کے پاک و ہند میں تشریف لانے کے بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں[1]۔ مستند روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ یہاں پر سیر و تفریح کی غرض سے[2]، یا مقاماتِ مقدسہ کی زیارت[3] کے لئے آئے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق وہ اپنے روحانی پیشوا کے حکم سے یہاں تشریف لائے تھے[4]۔ ان کے روحانی پیشوا شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی بتائے جاتے ہیں۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے حکم پر یہاں آئے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت زین العابدین جس زمانے میں یہاں تشریف لائے وہ تاریخِ عرب میں بڑی افراتفری کا زمانہ تھا[5]۔ ہمارے خیال میں پہلی روایت قابلِ قبول نہیں کیونکہ جس وقت حضرت زین العابدین یہاں تشریف لائے تھے کوئی خاص مقامات ایسے نہ تھے جن کی سَیر یا زیارت کی جاسکتی۔ باقی دو روایتیں قرینِ قیاس ہیں، کیونکہ اکثر صوفیا جو پاک و ہند میں تشریف لائے ان کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے معلوم

---

[1] ملک غوث خلیفہ دربار سخی سرور، نے حضرت زین العابدین کے پاک و ہند میں تشریف لانے کا واقعہ ایک اور ہی رنگ میں بیان کیا ہے جس کا ذکر اشارۃً پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ (دیکھیں کتاب ہذا، ذیلی نوٹ، ص ۱۲۱)۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سید زین العابدین اپنے والد سید عمر شاہ کی وفات کے بعد مسند پر بیٹھے اور بائیس سال تک آنحضرت علیہ السلام کے روضۂ اقدس کی خدمت کرتے رہے۔ ایک رات خواب میں آنحضرتؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ پاک و ہند میں جاؤ اور پنجاب میں رہ کر تبلیغِ اسلام کرو۔ لوگوں کو اللہ اور اللہ کے رسول کا سیدھا راستہ بتاؤ۔ حضرت زین العابدین آنحضرتؐ کے حکم پر یہاں آئے۔ اور پنجاب میں ملتان کے قریب شاہکوٹ نامی ایک گاؤں میں قیام فرمایا۔ انھوں نے اپنی تعلیمات اور تبلیغات سے عامۃ الناس کو فیض پہنچایا۔ (ملاحظہ ہو سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۹)

[2] مرقع ملتان، ص ۹۰ [3] CALCATTA REVIEW, VOL 60, 1875, P 78.

[4] تواریخ ملتان، ص ۹۰ ، مرقع ملتان، ص ۲۲۳

[5] LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P 306.

ہوتا ہے کہ وہ اپنے روحانی پیشوا کے حکم سے یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں آئے - علاوہ ازیں چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی کا زمانہ، جبکہ حضرت زین العابدین یہاں تشریف لائے، یقیناً انتہائی نازک زمانہ تھا[1]

تحقیقاتِ چشتی میں لکھا ہے[2] کہ جب حضرت زین العابدین شاہ کوٹ میں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں کا نمبردار، پیرا رہان، آپ کا معتقد بلکہ مرید ہوگیا - اس نے گاؤں میں آپ کے لئے ایک مسجد بنوادی، جہاں آپ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے - دو سال تک کوئی قابلِ ذکر بات رونما نہیں ہوئی - اس کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ جن سے آپ نے بغداد میں شادی کی تھی، فوت ہوگئیں - آپ نے ان کی نعش صندوق میں بند کر کے وطن واپس جانے کا ارادہ کیا - جب یہ حال گاؤں کے زمینداروں کو معلوم ہوا تو انھوں نے جمع ہو کر آپس میں صلاح مشورہ کیا اور یہ کہا کہ اتفاق سے ایک کامل ولی ہماری بستی میں آگئے تھے اور اب

---

[1] آر۔سی ٹیمپل کا بیان ہے کہ چھٹی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی کا زمانہ تاریخِ عرب میں افراتفری کا زمانہ تھا - ۴۶۷ھ تا ۵۱۲ھ مطابق ۱۰۷۵ء تا ۱۱۱۸ء کا عہد عباسی خلفا المقتدی باللہ اور المستظہر باللہ کے دورِ خلافت کو ظاہر کرتا ہے - ان دنوں سلجوقی حکمران جلال الدین ملک شاہ (۱۰۷۲ء-۱۰۹۲ء) اور سلطان برکیاروق (۱۰۹۲ء-۱۱۰۴ء) خلفاء پر چھائے ہوئے تھے اور بغداد میں ہر طرف ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی - ملک شاہ سلجوقی کے یروشلم میں پہنچنے کی وجہ سے شام کے اندر عیسائی غلبہ پا رہے تھے - مصر کے فاطمی خلیفہ مستعالی باللہ ابوالقاسم احمد (۱۰۹۴ء-۱۱۰۰ء) کے عہدِ خلافت میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی - تقریباً اسی زمانے میں ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد خاندان سلجوقیہ زوال پذیر ہوا اور حشیشیوں یعنی اسماعیلی حسن صباح کی زیرِ قیادت برسرِ اقتدار آئے اور انھوں نے معاشرہ میں ایک کھلبلی پیدا کر دی - حسن صباح (۱۰۷۹ء-۱۱۲۴ء) تاریخ میں پیرِ جبل کے لقب سے بھی مشہور ہے -
ملاحظہ ہو: LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P306.

[2] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۰ -

یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا جانا ہمارے حق میں اچھا نہیں۔ ان کے یہاں رہنے کی صورت اب یہ ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دے۔ شاید اسی وجہ سے حضرت مستقل طور پر یہیں قیام فرمالیں۔ چنانچہ سب نے بیک زبان ہو کر پیرا رہان نمبردار سے کہا کہ آپ ہمارے افسر ہیں اور آپ کے گھر میں اس وقت دو لڑکیاں ہیں۔ اگر آپ ایک لڑکی کی شادی فی سبیل اللہ ان سے کر دیں تو اچھا ہے۔ اور تمام برادری یہ وعدہ کرتی ہے کہ آپ کو اس امر کا طعنہ نہیں دے گی کہ آپ نے غیر قوم میں اپنی لڑکی کی شادی کیوں کی۔ پیرا رہان نے زمینداروں کی یہ بات قبول کر لی، اور اپنی بڑی لڑکی کی شادی، جس کا نام عائشہ تھا[1]، حضرت زین العابدین سے کر دی۔ شادی سے کوئی سال دو سال بعد ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا، جس کا نام سید احمد سلطان تھا اور جس نے آگے چل کر سخی سرور کے لقب سے شہرت پائی۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام عبدالغنی تھا۔ لیکن خان ڈھوڈا کے لقب سے مشہور ہوا۔[2]

---

[1] پیرا رہان کی دوسری لڑکی کا نام بی بی رابعہ تھا جس کی شادی قوم کھوکھر کے ایک فرد سے ہوئی تھی۔ (تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۲)

[2] ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے اس سلسلے میں کچھ اور ہی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ حضرت زین العابدین جب شاہ کوٹ میں اقامت پذیر ہوئے، تو " وقت عبدالخالق بخاری نام کے کوئی شخص بھی وہاں آباد تھے۔ حضرت زین العابدین نے اس کی لڑکی سے نکاح کیا، جس کا نام بی بی عائشہ تھا۔ اس خاتون کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام سید احمد سلطان اور دوسرے کا سید عبدالغنی تھا۔ (سوانح حیات سخی سرور، ص ۹)۔ ذرا آگے چل کر ملک غوث نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت زین العابدین نے کھوکھر قوم کے ایک شخص مسمی پیرا کی لڑکی سے بھی نکاح کیا تھا ان سے ان کے ہاں تین لڑکے پیدا ہوئے: (۱) سید داؤد (۲) سید محمود اور (۳) سید سہرا۔ (سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۹) ہمارے خیال میں ملک غوث نے واقعات کو غتر بود کر دیا ہے۔

تواریخ ملتان میں مذکور ہے[1] کہ جب حضرت زین العابدین پاک و ہند میں تشریف لائے تو ان کے ہمراہ ان کی بیوی ایمنہ[2] تھی۔ اور جب ملتان کے قریب سکونت پذیر ہوئے تو وہاں میر لاڑ[3] نامی کوئی شخص حکمران تھا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں، جن میں ایک کا نام بی بی عائشہ تھا، اس کا نکاح حضرت زین العابدین سے ہوا اور دوسری کی شادی گھنو خاں پٹھان، حاکم ملتان سے ہوئی۔[4] اسی کتاب میں یہ بھی مرقوم ہے[5] کہ جب حضرت زین العابدین ملتان

اصل صرف یہ ہے کہ حضرت زین العابدین نے ایک شادی بغداد میں کی تھی اور جس لڑکی سے کی تھی اس کا نام ایمنہ (فاطمہ) تھا۔ اس لڑکی سے جو اولاد ہوئی ان کے نام سید داؤد، سید محمود اور سید سہرا ہیں۔ دوسری شادی حضرت زین العابدین نے شاہ کوٹ میں آکر کی تھی۔ اور جس لڑکی سے کی تھی اس کا نام بی بی عائشہ تھا۔ وہ شاہ کوٹ کے نمبردار پیرا کی بیٹی تھی اور کھوکھر قوم سے تھی۔ اس خاتون سے ان کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام سید احمد سلطان اور دوسرے کا عبدالغنی تھا۔ کسی کتاب یا تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بی بی عائشہ عبدالخالق بخاری کی صاحبزادی تھیں۔

[1] تواریخ ملتان، ص ۹۰-۹۱۔ نیز دیکھیں مرقع ملتان، ص ۲۲۳۔

[2] بعض جگہوں پر حضرت زین العابدین کی پہلی بیوی کا نام فاطمہ مذکور ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:
NORTH INDIAN NOTES AND QUERIES 1894 Vol. IV, P 39- اور
-CALCATTA REVIEW, 1875, VOL 60, P 78.

[3] غالباً اسی حاکم کے نام پر موضع لاڑ مشہور ہے جو شاہکوٹ یا سہ کوٹ کے قریب واقع ہے۔ (مرقع ملتان، ص ۲۲۳)

[4] یہ روایت کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جیسا کہ کتاب ہذا کے مطالعہ سے معلوم ہوگا گھنو خاں پٹھان حضرت سخی سرور کا خسر تھا۔ اگر ہم اس روایت کو صحیح مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گھنو خاں آپ کا خالو بھی تھا اور جن خالہ زاد بھائیوں کو آپ سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ گھنو خاں کے بیٹے اور آپ کے سالے تھے۔ کسی کتاب یا تذکرہ سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی۔ تحقیقات چشتی میں آپ کے خالہ زاد بھائیوں کی دشمنی کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے خالہ زادے پیرا رہان کی دوسری بیٹی بی بی رابعہ کے فرزند تھے۔ جس کی شادی کھوکھر قوم کے ایک فرد سے ہوئی تھی۔ مؤلف تواریخ ملتان نے

کے متصل سکونت پذیر ہوئے تو وہاں ہر طرف گورستان تھا اور کوئی آبادی تھی۔ رفتہ رفتہ آبادی شروع ہوئی اور اس جگہ کا نام جہاں آپ مقیم تھے چک زین العابدین مشہور ہو گیا۔

حضرت زین العابدین کی دونوں بیویوں سے جو اولاد پیدا ہوئی ان کے نام تواریخ ملتان میں درج ہیں۔ اس میں لکھا ہے[1] کہ آپ کی پہلی بیوی بی بی ایمنہ (فاطمہ)[2] کے بطن سے سلطان قیصر المعروف سید داؤد۔ سید محمود۔ سید سہرا اور دوسری بیوی بی بی عائشہ کے بطن سے سید احمد سلطان المعروف سخی سرور اور سید عبدالغنی المعروف خان جٹی یا خان ڈھوڈا پیدا ہوئے۔ سلطان قیصر اور سید سہرا کی قبریں بخارا میں بتائی جاتی ہیں۔ سید محمود، سید احمد سلطان اور سید عبدالغنی کے مزار یہیں واقع ہیں[3]۔ سید محمود اور سید عبدالغنی تو اپنے باپ کے قریب شاہکوٹ میں مدفون ہیں[4]۔ لیکن سید احمد سلطان کا روضہ مقدس ڈیرہ غازی خان میں ہے۔

حضرت زین العابدین کے حالات سے متعلق جو کچھ ہماری نظر سے گزرا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی شاہکوٹ میں بسر کی۔ کسی ماخذ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ

جو کچھ بیان کیا ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ (ملاحظہ ہو: تحقیقات چشتی، ص ۲۰۲ - ۲۰۴)

۵؎ تواریخ ملتان، ص ۹۰

۱؎ تواریخ ملتان، ص ۹۰

۲؎ بعض جگہوں پر حضرت سخی سرور کی سوتیلی ماں یعنی حضرت زین العابدین کی پہلی بیوی کا نام رستم خاتون مرقوم ہے۔ لیکن یہ بات قرین یقین معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جیسا کہ آر سی ٹیمپل نے بھی لکھا ہے۔ یہ نام مغلیہ طرز کے ناموں کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس زمانے میں ایسے ناموں کا ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ (ملاحظہ ہو:

(LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL II, P 118)

۳؎ تواریخ ملتان، ص ۹۰

۴؎ ایضاً۔ بعض کتابوں میں مرقوم ہے کہ سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا بغداد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ کوئی خاص مشہور شخصیت نہیں تھے۔ (GLOSSARY. VOL 1, P 566.

(PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.

کبھی اس گاؤں سے باہر نکلے تھے - قیاس چاہتا ہے کہ وہ ملتان تو ضرور آتے جاتے ہوں گے کیونکہ اس گاؤں سے ملتان کا کوئی خاص فاصلہ نہیں - البتہ ملتان کے علاوہ وہ کسی اور شہر میں گئے یا نہیں - اس کے بارے میں ہمارے پاس اطلاعات نہیں ہیں -

کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زین العابدین نے ذریعہ معاش زراعت کو قرار دیا تھا - چنانچہ آر - سی ٹیمپل نے ان کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں ان میں ایک جگہ درج ہے[۱] کہ وہ اپنے گاؤں میں کھیتی باڑی کرتے تھے - حضرت سخی سرور نے بھی اپنے والد کے اس پیشہ کو اپنایا تھا بلکہ آپ نے تو زراعت کے علاوہ بھیڑ بکریاں پالنے کا شغل بھی اختیار کیا تھا -

تواریخ ملتان[۲] ، مرقع ملتان[۳] اور گزیٹیر ملتان[۴] سے پتا چلتا ہے کہ حضرت زین العابدین نے انتقال بھی اسی گاؤں میں کیا تھا اور ان کا مزار بھی وہیں موجود ہے - تواریخ ملتان میں بعنوان خانقاہ زین العابدین واقع سکوٹ (شاہکوٹ) یہ مرقوم ہے[۵] کہ یہ خانقاہ موضع شکوٹ (شاہکوٹ) میں واقع ہے - اس کے گرد پختہ چار دیواری ہے اور چار دیواری کے اندر خانقاہ بھی پختہ عمارت میں بنی ہوئی ہے - خانقاہ کے اندر حضرت زین العابدین کی تربت ہے - خانقاہ کے ساتھ شمال کی جانب ایک کوٹھڑی میں ان کی بیوی ، بی بی عائشہ ، کی قبر ہے - شمال مشرق کی طرف ان کے بڑے بیٹے سیّد محمود مدفون ہیں - خانقاہ کے متصل ایک مسجد ہے اور شمال کی سمت بلند اور خوبصورت دروازہ ہے - تمام کی تمام عمارت نہایت عمدہ اور پختہ ہے - کہتے ہیں درگا نامی ایک کھتری نے یہ خانقاہ بنوائی تھی اور تخمیناً ایک لاکھ روپیہ لاگت آئی - ۱۵ مانگھ کو اور ریکم ہاڑ

۱ھ LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P 302-307.

۲ھ تواریخ ملتان ، ص ۸۹ - ۹۱

۳ھ مرقع ملتان ، ص ۲۲۲ - ۲۲۳

۴ھ GAZETTEER OF MULTAN, 1923-24, P 125.

۵ھ تواریخ ملتان ، ص ۸۹ - ۹۰

سے ۲۹ ہاڑ تک اس خانقاہ پر بھاری میلہ لگتا ہے۔ دوابہ کا سنگ آتا ہے۔ پہلے میلہ کی رونق بہت زیادہ ہوتی تھی لیکن اب کچھ گھٹتی جا رہی ہے۔ خانقاہ پر جو چڑھاوے آتے ہیں ان سے تقریباً سو روپئے[1] کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ چھ کنوئیں خانقاہ کے لئے وقف ہیں۔

مرقع ملتان میں بھی کچھ اسی قسم کی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس میں تحریر ہے[2] کہ حضرت زین العابدین کا روضہ ملتان میں بستی ملوک کی سڑک پر موضع لاڑ کے قریب موضع شکوٹ (شاہکوٹ) میں واقع ہے۔ روضہ کی شمالی جانب ان کی اہلیہ محترمہ، بی بی عائشہ، کا مزار ہے۔ شمال مشرق میں فرزند کلاں، سید محمود، کی تربت ہے۔ ساری عمارت پختہ اور خوشنما ہے۔ ایک ہندو کھتری نے جس کا نام درگاہ تھا اور لاہور کا رہنے والا تھا، یہ روضہ بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر میں اس وقت ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ چھت میں صندل کے شہتیر لگے ہیں۔ ہاڑ کے مہینے میں زبردست میلا لگتا ہے اور دوآبہ سے سنگ یعنی مریدوں کی جماعت آکر اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ذرا آگے چل کر اسی کتاب میں مرقوم ہے[3] کہ خانقاہ پر تیل اور چھوٹے چھوٹے تکیوں کا چڑھاوا چڑھتا ہے۔ کئی من تیل ہر وقت موجود رہتا ہے اور زربفت، بادلہ اور گوٹہ کناری سے منقش رنگ برنگے تکیے لٹکتے رہتے ہیں۔ مزار پر حاضر ہونے والوں کو ایک خاص روحانی کیفیت اور وجدانی لذت حاصل ہوتی ہے۔ روضہ اقدس پر ہر وقت مجاور بیٹھے رہتے ہیں۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت زین العابدین کی اولاد میں سے اب کوئی باقی نہیں رہا۔

گزیٹیر ملتان میں مندرج ہے[4] کہ ملتان میں بہت سے مقبرے اور خانقاہیں ہیں۔ ان میں ایک حضرت زین العابدین کا مزار پر انوار ہے جو موضع شکوٹ (شاہکوٹ) میں واقع ہے۔ اس

---

[1] یاد رہے کہ یہ آمدنی تواریخ ملتان کی تصنیف سے قبل یعنی ۱۸۸۴ء سے پیشتر کی ہے۔ جبکہ ایک روپے کی کافی قیمت تھی۔

[2] مرقع ملتان، ص ۲۲۲ [3] مرقع ملتان، ۲۲۳

[4] GAZETTEER OF MULTAN, 1923-24, P 125.

مزار پر ٹائیلوں کا نہایت خوبصورت اور عمدہ کام کیا گیا ہے اور اس کا صدر دروازہ بڑا ہی دیدہ زیب ہے۔ ہر لحاظ سے مقبرہ قابلِ دید ہے۔ لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے ہیں۔

حضرت زین العابدین نے کب وفات پائی؟ اس سلسلے میں کہیں کوئی بات مذکور نہیں ہے۔ صرف تواریخ ملتان میں یہ لکھا ہے[۱] کہ انھوں نے ۵۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سال وفات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت سخی سرور نے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ۵۷۰ھ[۲] یا ۵۷۷ھ[۳] میں وفات پائی تھی۔ اور اکثر کتابوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور اپنے والد کے انتقال کے بعد بغداد گئے تھے[۴]۔ آپ کے بغداد جانے کا سال تذکروں میں ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰ء[۵] درج ہے۔ اگر یہ سال درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت زین العابدین ۵۹۷ھ میں نہیں بلکہ ۵۳۵ھ میں یا اس سے ذرا قبل فوت ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے تواریخ ملتان میں ان کی وفات کا جو سال بتایا گیا ہے، غلط ہو جاتا ہے[۶]۔

حضرت زین العابدین کے حالاتِ زندگی کسی قدر بیان کرنے کے بعد ہم ان کے فرزند ارجمند، حضرت سخی سرور، کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کے متعلق کیا کچھ لکھا ہے۔

۱؎ تواریخ ملتان، ص ۹۰

۲؎ LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P351. ، PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P133. ، GLOSSARY, VOL 1, P567.

۳؎ خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۳ - ج دوم، ص ۲۴۸ - تحقیقات چشتی، ص ۲۰۰ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸ -

۴؎ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P133. ، GLOSSARY, VOL, 1, P 567.

۵؎ ایضاً

۶؎ اس مسئلہ پر آگے بھی کچھ بحث کی گئی ہے۔ دیکھیں کتاب ہٰذا (ذیلی نوٹ)، ص ۱۶۴، ۱۸۷ -

نام اور القاب

کم وبیش تمام تذکرہ نگار متفق الرائے ہیں[1] کہ حضرت سخی سرور کا نام سید احمد سلطان ہے[2] اور آپ کو کئی ایک القاب سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً سخی سرور[3]، لکھ داتا[4]، لکھی خان[5]، لالانوالہ[6] روھیانوالہ[7]، پیر خانو[8]، پیر کانو یا کانون[9]، شیخ راونکون[10] لیکن زیادہ تر آپ سخی سرور یا لکھ داتا

---

[1] مثال کے طور پر دیکھیں: خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۱ - ج دوم، ص ۲۴۶ - تحقیقات چشتی، ص ۱۸۹ - آب کوثر، ص ۹۱ - چشمۂ کوثر، ص ۸۱ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۳۵ -

[2] بعض کتابوں میں آپ کا نام مختلف صورتوں میں درج ہے - مثلاً سیدی احمد - (PUNJAB AND - ITS FEUDATORIES, P132: GLOSSARY, VOL 1, P 566 -) سعید احمد (تحقیقات چشتی، ص ۲۰۱) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نام کی یہ صورتیں یا تو کتابت کی غلطی سے پیدا ہوئی ہیں اور یا طباعت کی خامی کا نتیجہ ہیں - کیونکہ انہی کتابوں میں بعض مقامات پر آپ کا نام سید احمد بھی لکھا ہوا ہے -

[3] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۱ - ج دوم، ص ۲۴۵ - خلاصۃ التواریخ، ص ۶۲

[4] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132. GLOSSARY - VOL 1, P566. خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۱ - ج دوم، ص ۲۴۵ - آب کوثر، ص ۹۱ - چشمۂ کوثر، ص ۸۱ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۵ -

[5] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۱ - ج دوم، ص ۲۴۵ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۵ -

[6] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ۴۸، ۵ - ہفت تماشائے قتیل، ص ۹۰ - دربار ملی، ص ۳۵۹ - GLOSSARY, VOL 1, P566. PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.

[7] GLOSSARY, VOL 1, P566، PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.

[8] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی قلمی)، ص ۴۱۸ - (مجموعہ آذر قلمی)، ص ۵۲۸ - خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۱، ج دوم ص ۲۴۵

[9] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی قلمی)، ص ۴۱۸ - (مجموعہ آذر قلمی)، ص ۵۲۸ -

[10] تواریخ ملتان، ص ۹۰ -

کے لقب سے مشہور ہیں۔ سخی سرور کا لقب تو اتنا معروف ہے کہ ڈیرہ غازی خاں میں وہ جگہ، جہاں آپ کا مزار واقع ہے، سخی سرور کے نام سے موسوم ہے۔ ذیل میں مذکورہ بالا القاب کی وجہ تسمیہ درج کی جاتی ہے۔

۱۔ سخی سرور: اکثر کتابوں میں مرقوم ہے[۱] کہ آپ بڑے دریادل تھے۔ جو کچھ آپ کے پاس آتا راہِ خدا میں لٹا دیتے۔ حتیٰ کہ شادی میں جو جہیز آپ کو ملا وہ بھی آپ نے محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ اسی بنا بر آپ کو سخی سرور کہا جاتا ہے۔ اس لقب کی وجہ تسمیہ ایک یہ بھی ہے کہ آپ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ جو کوئی آپ کے پاس مراد لے کر آتا، کبھی نامراد نہ جاتا۔[۲] آپ کے فیوض اس قدر عام تھے کہ ہر شخص، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، ان سے بہرہ ور ہو سکتا تھا۔[۳]

۱۔ مثلاً دیکھیں: آبِ کوثر، ص ۹۱ - چشمۂ کوثر، ص ۸۱ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۷ -

۲۔ ایضاً

۳۔ ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے اس ضمن میں ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت سید احمد سلطان پیلو کے درخت (جال) کے نیچے عبادت کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک سوالی نے سوال کیا کہ حضرت آپ کا نام کیا ہے؟ کہا: میرا نام سید احمد سلطان ہے۔ پھر سوالی نے کہا: میں دلّی کا رہنے والا ہوں۔ آپ کا نام سن کر خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے ایک لاکھ روپے کی سخت ضرورت ہے۔ مہربانی فرما کر عنایت کیجئے۔ حضرت نے کہا: آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ میں اس وقت عبادت کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کو ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا۔ پھر حضرت عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر حضرت کا ایک مرید اس سوالی کے پاس پہنچا۔ اس نے دریافت کیا: بھائی صاحب! اس جگہ پر کیسے تشریف فرما ہیں؟ اس نے جواب دیا: میں نے حضرت کا نام سنا ہے اور ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ بڑے فیاض اور سخی ہیں۔ اس وقت مجھے ایک لاکھ روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اسی لئے حضرت کے پاس آیا ہوں۔ وہ میرا سوال پورا کریں گے۔ مرید نے فوراً ہی ایک لاکھ روپیہ سوالی کو دے کر رخصت کیا۔ اس دن سے حضرت کو سخی سرور کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

۲۔ لکھ داتا: اس لقب کی وجہ تسمیہ بھی تقریباً ایسی ہی ہے جیسی کہ سخی سرور کی۔ ایچ اے روز، ایڈورڈ مکلیگن کے حوالے سے لکھتے ہیں[۱] کہ لکھ داتا کا مطلب ہے لاکھوں دینے والا۔ یعنی وہ آدمی لکھ داتا کہلاتا ہے جو غیر معمولی طور پر فیاض اور سخی ہو۔ چونکہ حضرت سخی سرور لوگوں کی دینی اور دنیوی دونوں مرادیں پوری کرتے تھے اس لئے آپ لکھ داتا کہلائے[۲]

۳۔ لکھی خان: یہ لقب بھی لکھ داتا کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ اس کی دوسری صورت ہے۔ چنانچہ لکھی خان اور لکھ داتا کی وجہ تسمیہ ایک ہی ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

۴۔ لالانوالہ: منشی حکم چند لکھتے ہیں[۳] کہ حضرت سخی سرور کا یہ لقب اس لئے مشہور ہے کہ زمانۂ سابق میں آپ کی خانقاہ پر کچھ لال تھے۔ ایچ اے روز[۴] اور ایڈورڈ مکلیگن[۵] نے تحریر

(سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۱۳-۱۴)۔ اس واقعہ کی صحت پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سید احمد سلطان کا لقب سخی سرور ان کی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے مشہور ہوا۔ یہ فیاضی اور سخاوت دینی اور دنیوی دونوں معاملات سے تعلق رکھتی تھی۔ یعنی وہ لوگوں کو بقدر استطاعت مال و دولت بھی دیتے تھے اور ان کی دلی آرزوؤں، خواہشوں اور مرادوں کو بھی پورا کرتے تھے۔

۱ؔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.- GLOSSARY, VOL 1, P 566.

۲ؔ اس سلسلے میں ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، رقم طراز ہیں کہ حضرت سخی سرور تبلیغ اسلام کرتے ہوئے بالآخر اس جگہ پہنچے جس کو آجکل سخی سرور کہا جاتا ہے۔ آپ نے کافی عرصہ یہاں پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی اور اپنے شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بسر کئے۔ آپ کا فیض عام تھا، جو سائل آتا اپنی مراد لے کر جاتا۔ آپ کی برکت اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کا دامن موتیوں سے بھر جاتا۔ آپ کے روحانی فیض اور قرب الٰہی کا چرچا اتنا ہمہ گیر ہوا کہ پاک و ہند کے گوشے گوشے سے لوگ گروہ در گروہ آتے اور سعادت دارین حاصل کرتے۔ آخر آپ لوگوں میں لکھ داتا کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ (سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۱۱-۱۲)

۳ؔ تواریخ ڈیرہ غازی خاں، ص ۵۴

۴ؔ GLOSSARY, VOL 1, P 566.

۵ؔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 432.

کیا ہے کہ لالانوالہ کے معنی ہیں ہیرے والا۔ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ نے دو قیمتی ہیرے آپ کی خانقاہ پر چڑھائے تھے۔ نیز سلطان زمان شاہ نے کچھ جواہرات خانقاہ کی نذر کیے تھے۔ اسی بنا پر حضرت سخی سرور کو لالانوالہ کہتے ہیں[۱]۔ لیکن اس صورت میں اس لقب کی صحیح املا لعلانوالہ ہونی چاہیئے کیونکہ لعل کے معنی ہیرا ہیں لال کے نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پنجابی زبان کے زیرِ اثر لعلانوالہ کو لالانوالہ لکھ دیا گیا ہو۔ اور املا کے اختلاف کی وجہ یہی ہو۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۸۳ء میں نادر شاہ اور سلطان زمان شاہ کے پیش کردہ ہیرے جواہرات تلف ہو گئے۔ جس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سال خانقاہ میں اچانک آگ لگ گئی تھی[۲] اور بہت سی قیمتی اشیا جل کر راکھ ہو گئیں۔

۵۔ روہیانوالہ : ایچ۔ اے روز[۳] اور ایڈورڈ مکلیگن[۴] لکھتے ہیں کہ اس لفظ کا مطلب ہے پہاڑ میں رہنے والا۔ چونکہ حضرت سخی سرور نے کوہ سلیمان کی گھاٹیوں میں توطن اختیار کیا تھا

۱؎ مرزا محمد حسن قتیل نے بھی اس لقب کی وجہ تسمیہ یہی کچھ بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلاطین تیموریہ کے تسلط سے قبل کسی بادشاہ نے حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر دو بدخشانی لعل چڑھائے تھے۔ اسی دن سے آپ کو پیر صاحب لعل (لعلانوالہ یا لالانوالہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بھرائی قوم کے افراد اپنے گیتوں میں حضرت سخی سرور کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے بڑے ڈھول تاشے بجاتے ہوئے خود بھی ناچتے ہیں اور سامعین کو بھی نچاتے ہیں۔ پنجاب میں ان کا رقص لڈی کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں ان کے گیت میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ اور اکثر لوگ سن کر رونے لگتے ہیں۔ (ہفت تماشائے قتیل، ص ۹۰۔ نیز دیکھیں دربار ملی، ص ۳۵۹)

۲؎ PUNJAB NOTES AND QUERIES, SEPT 1884, VOL 1, P133, PARA, 999-

GAZETTEER OF DERA GHAZI KHAN, P 51-54، نیز دیکھیں، VOL III, PARA, 82.

GLOSSARY, VOL 1, P 568.، CENSUS REPORT: D. G. KHAN, P 1-22.

۳؎ GLOSSARY, VOL 1, P 566.

۴؎ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.

اس لئے آپ کو روہیانوالہ کہا جاتا ہے۔

۶- **پیر خانو، پیر کانو یا کانون:** اس لقب کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی۔ سوائے خزینۃ الاصفیا[1] اور معارج الولایت[2] کے یہ لقب کسی اور جگہ درج نہیں۔ ان دونوں کتابوں میں بھی پتہ نہیں کہ یہ لقب کس سند پر تحریر کیا گیا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ لقب حضرت سخی سرور کو پٹھانوں نے دیا ہوگا اور اس کی اصل صورت پیر خان ہو گی جو رفتہ رفتہ بگڑ کر یا کسی اور وجہ سے پیر خانو، پیر کانو یا پیر کانون بن گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے عقیدت مندوں میں جہاں اور قوموں اور ذاتوں کے لوگ شامل ہیں وہاں پٹھانوں کی بھی اکثریت ہے۔ چنانچہ پشاور میں ہر سال آپ کی یاد میں ایک بھاری میلہ لگتا ہے۔ یہ میلہ پشاور کے عوامی میلوں میں شمار ہوتا ہے اور عرف عام میں جھنڈا میلہ یا جھنڈوں کا میلہ کہلاتا ہے[3]۔ اس میلے کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

۷- **شیخ راونکون:** یہ لقب صرف تواریخ ملتان[4] میں درج ہے۔ اس کا اصل سبب معلوم نہیں۔ چنانچہ وجہ تسمیہ کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

شجرۂ نسب

تقریباً تمام کتابوں میں درج ہے کہ حضرت سخی سرور حسینی سید ہیں[5]۔ آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے جا ملتا ہے۔ یہ سلسلہ مفتی غلام سرور نے اپنی

۱ھ خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۱ - ج دوم، ص ۲۴۵

۲ھ معارج الولایت (مجموعہ شیرانی: قلمی)، ص ۱۸ا ۴ - (مجموعہ آذر: قلمی) ص ۵۲۸ -

۳ھ PESHAWAR GENSUS REPORT, PESHAWAR, 1961, P 1-22 GAZETTEER, 1897-98, P 114.

۴ھ تواریخ ملتان، ص ۹۰

۵ھ مرقع ملتان، ص ۲۲۳- منشی حکم چند لکھتے ہیں کہ پٹھان لوگ یہ کہتے ہیں کہ سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور قوم کے پٹھان تھے (تواریخ ضلع ڈیرہ غازیخان، ص ۴۴) لیکن اس امر کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی۔

کتاب خزینۃ الاصفیا[1] میں تشریف الشرفا کے حوالے سے درج کیا ہے۔ تلاش و جستجو کے باوجود تشریف الشرفا کا کوئی نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ تاہم اس سے خزینۃ الاصفیا کے ذریعہ استفادہ کیا گیا ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں آپ کا شجرۂ نسب یوں درج ہے:

سیّد احمد (سلطان) بن سیّد زین العابدین بن سیّد عمر بن سید عبد اللطیف بن سیّد بہاالدین بن سیّد غیاث الدین بن سیّد بہاالدین بن سیّد صلاح الدین بن سیّد زین العابدین بن سیّد عیسٰی بن سیّد صالح بن سیّد عبد الغنی بن سیّد جلیل بن سیّد خیر الدین بن سیّد ضیاء الدین بن سیّد داؤد بن سیّد عبد الجلیل رومی بن سیّد اسمٰعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین علی بن سیّد الکونین امام حسین بن علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہٗ[2]۔

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹ - ج دوم، ص ۲۴۵ بحوالہ تشریف الشرفا - نیز دیکھیں تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۵ - عرس اور میلے، ص ۸۸۔

[2] منشی حکم چند نے حضرت سخی سرور کا شجرہ نسب یوں تحریر کیا ہے:

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ

حضرت امام حسین

امام محمد باقر

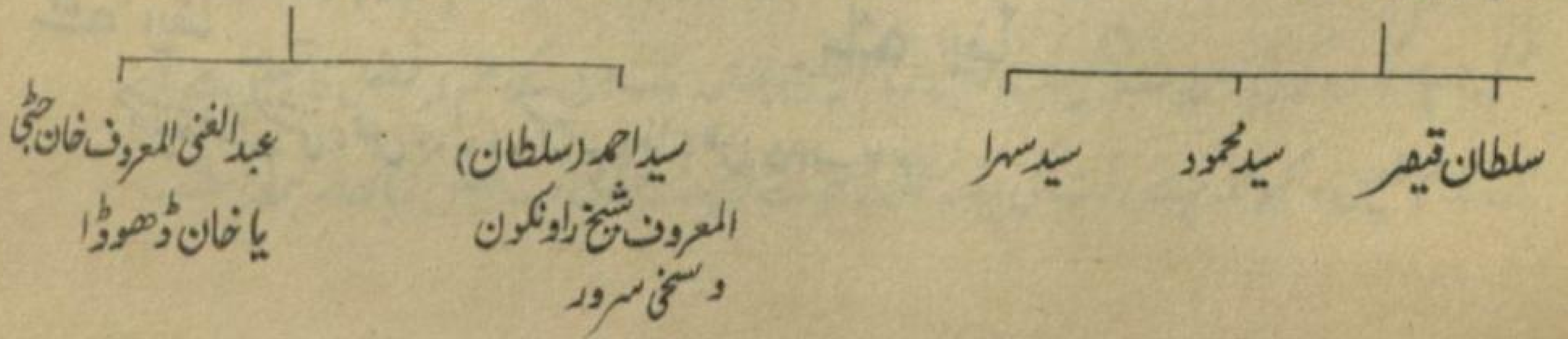
امام محمد جعفر

اسمٰعیل

عبد اللطیف

سیّد عمر

شیخ شجاع



حضرت سخی سرور کی تاریخ ولادت کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ سر ڈینزل ابٹسن[۱] کا کہنا ہے کہ آپ بارھویں صدی عیسوی میں کسی وقت پیدا ہوئے۔ میجر ٹیمپل[۲] کی رائے یہ ہے کہ آپ کا زمانہ تیرھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اس کے علاوہ سکھوں کی مذہبی کتابوں میں کچھ ایسی باتیں بھی مرقوم ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ آپ گورو نانک (۱۵۲۶ تا ۱۵۹۶ سمت)[۳] کے معاصرین میں سے تھے[۴] ان کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ آپ نے گورو نانک کو ایک تربوز بھی پیش کیا تھا[۵]

ہماری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ حضرت سخی سرور چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں کسی وقت پیدا ہوئے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آپ کے والد ماجد، حضرت سیّد زین العابدین ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء میں پاک و ہند تشریف لائے تھے[۶] یہاں پر انھوں نے کوئی دو سال بعد شاہکوٹ کے نمبردار، پیر دھان، کی صاحبزادی، بی بی عائشہ، سے نکاح کیا[۷]

مفتی غلام سرور اور منشی حکم چند کے مندرجہ شجرۂ نسب کے تقابلی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ منشی حکم چند نے مفتی غلام سرور کی فراہم کردہ معلومات میں بعض باتوں کا اضافہ کیا ہے اور بعض کی کمی کی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت زین العابدین کی اولاد کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے اور ان کے آبا و اجداد میں سے کچھ نام حذف کر دیئے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ملتان، ص ۹۰)

۱۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132. ، GLOSSARY, VOL 1, P 566.

۲۔ ایضاً

۳۔ بابا نانک سکھوں کے پہلے گورو تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ ۱۰ اسوج سمت ۱۵۹۶ کو بمقام کرتار پور چادر تان کر لیٹے اور گم ہو گئے۔ (دیکھیں تحقیقات چشتی، ص ۱۵۴)

۴۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P132. ، GLOSSARY, VOL 1, P566.

۵۔ ایضاً ۶۔ ایضاً

تحقیقات چشتی، ص ۲۰۰، کتاب ہذا، ص ۱۲۵-۱۲۶

اور اس نکاح کے کوئی سال دو سال بعد حضرت سخی سرور کی ولادت ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زین العابدین نے ۵۲۲ھ مطابق ۱۱۲۸ء میں بی بی عائشہ سے شادی کی اور ۵۲۳-۵۲۴ھ مطابق ۲۹-۱۱۳۰ء کے لگ بھگ ان کے ہاں حضرت سخی سرور پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت

ہمارے پاس ایسے تذکرے نہیں ہیں جن سے یہ پتا چل سکے کہ حضرت سخی سرور کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کے والد، حضرت زین العابدین نے کیا طریقے اختیار کئے۔ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کم عمری میں اپنے والد سے علوم شرعی سیکھتے رہے اور پھر ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے آپ لاہور تشریف لائے[۱] یہاں ان دنوں مولانا سید محمد اسحاق[۲] کے علم و فضل کا چرچا

---

[۱] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۵ - آپ کوثر، ص ۹۱ - چشمۂ کوثر، ص ۸۱ -
تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۶ - عرس اور میلے، ص ۸۹ - الفقر فخری، ص ۷۲-

[۲] ایڈورڈ مکلیگن اور ایچ اے روز نے میجر ٹیمپل کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا سید محمد اسحاق اچہ کے رہنے والے تھے، جو ریاست بہاولپور میں واقع ہے۔ انھوں نے اپنے چچا سید صدرالدین راجہ قتال کے زیر سایہ سہارن پور میں تعلیم حاصل کی۔ اور ۱۴۶۰ء میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے حضرت سخی سرور کا مولانا سید محمد اسحاق سے علوم ظاہری کی تکمیل کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ (دیکھیں PUNJAB -

1- AND ITS FEUDATORIES, P 132. ' GLOSSARY, VOL 1, P 566-67.

اس میں شک نہیں کہ تذکرہ علمائے ہند یا کسی اور ماخذ سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ مولانا سید محمد اسحاق نام کے کوئی عالم حضرت سخی سرور کے زمانے میں لاہور میں موجود تھے۔ تاہم خیال ہے کہ میجر ٹیمپل کو مغالطہ ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ جن مولانا کا ذکر میجر ٹیمپل نے کیا ہے وہ کوئی اور ہوں اور حضرت سخی سرور کے استاد کوئی اور۔ چونکہ کسی تذکرے سے ان کی بابت حال معلوم نہیں ہوتا اس لئے بہت ممکن ہے کہ وہ کوئی معروف شخصیت نہ ہوں۔ لیکن جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے اس میں کلام نہیں۔ کیونکہ اپنے وقت کی ایک مشہور ہستی نے ان سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ہمارا مطلب

تھا۔ دور دور سے علم کے متوالے کشاں کشاں ان کے پاس آتے اور علم کی پیاس بجھاتے۔ حضرت سخی سرور نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ایک ہونہار شاگرد کی طرح بتدریج علوم شریعت کے ارتقائی منازل طے کئے۔ مولانا کی صحبت سے مستفید ہو کر آپ میں وہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں، جو ایک عالم دین کا خاصہ ہوتی ہیں۔

ذریعۂ معاش

جیسا کہ حضرت زین العابدین کے حالات میں بیان ہوا، حضرت سخی سرور نے کھیتی باڑی اور بھیڑ بکریاں چرانے کو اپنا شغل بنایا تھا، کم و بیش تمام تذکروں اور کتابوں[1] میں مرقوم ہے کہ حضرت سخی سرور اپنے گاؤں میں بھیڑ بکریاں چرایا اور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔ بھیڑ بکریاں چرانے کی بابت جو قصہ ہماری نظر سے گزرا ہے وہ تحقیقاتِ چشتی میں درج ہے۔ اس میں لکھا ہے[2] کہ جب حضرت سخی سرور نے اپنی عمر کے بارھویں سال میں قدم رکھا تو اپنے والد، حضرت زین العابدین، سے کہا کہ بابا! اس گاؤں کے تمام لڑکے بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ یہی شغل اختیار کروں۔ اس پر آپ کے والد نے کہا کہ بیٹا ہم تو ملاّں لوگ اور مسافر ہیں ہمیں بھیڑ بکریوں سے کیا کام۔ ہماری کوئی زمین بھی ہے جہاں تم بھیڑ بکریاں چرا سکو۔ حضرت سخی سرور نے کہا کہ یہ گاؤں ہمارے نانا کا ہے[3]۔ کیا ہم کو یہاں بھیڑ بکریاں چرانے نہیں دی جائیں گی۔ مختصر یہ کہ بیٹے کے اصرار پر باپ نے پانچ بکریاں لے دیں اور کہا کہ بیٹا جاؤ اور کھیلو۔

ــــــــ ہے کہ حضرت سخی سرور نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس بات کا ذکر اکثر و بیشتر کتابوں میں موجود ہے۔

[1] خزینۃ الاصفیاء، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۵۔ تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۱۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۲۲۶۔

[2] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۱۔ ۲۰۲

[3] یعنی پیرا دھان، جو کھوکھر قوم کا معزز فرد اور شاہکوٹ کا نمبردار تھا۔ وہ حضرت زین العابدین کا خسر اور حضرت سخی سرور کا نانا تھا۔ حضرت زین العابدین نے اسی کی بڑی صاحبزادی، بی بی عائشہ، سے شادی کی تھی جس کے بطن سے حضرت سخی سرور پیدا ہوئے تھے۔ (دیکھیں کتاب ہذا، ص ۱۲۶)

حضرت سخی سرور کی زراعت سے رغبت اور عملاً کھیتی باڑی کرنے کا ذکر یوں تو تقریباً ہر کتاب[1] میں نظر آتا ہے لیکن تحقیقاتِ چشتی میں ذرا تفصیل سے درج ہے۔ اس میں لکھا ہے[2] کہ شاہکوٹ کا نمبردار، پیرا دھان، حضرت زین العابدین کا بڑا ادب کرتا تھا اور اپنی زراعت میں سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ بطور نذرانہ دیتا تھا۔ وہ اس نذرانے کو فقیروں میں خرچ کر دیتے تھے۔ پیرا دھان کے گھر میں بی بی عائشہ اور بی بی رابعہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو خالہ زاد بھائیوں نے حضرت سخی سرور سے کہا کہ اب نانا مر گیا ہے۔ اس کی زمین ہم تم کو آپس میں تقسیم کر لینی چاہیے۔ آپ نے کہا: بابا ہم تو فقیر ہیں۔ ملّاں اور طالبعلم ہیں۔ ہمیں زمین اور زراعت سے کیا کام۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ مگر خالہ زاد بھائیوں نے تعجب کی بنا پر قبول نہیں کیا اور سوچا کہ کیوں خواہ مخواہ ان کے ممنون ہوں۔ چنانچہ جب انھوں نے بیحد اصرار کیا تو حضرت زین العابدین نے کہا: بیٹا! قبول کر لو۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ زمین پر تمہارا بھی حق ہے۔ باپ کے کہنے پر آپ نے خالہ زاد بھائیوں کی پیش کش قبول کر لی۔

گھنو خان، حاکمِ ملتان کی بیٹی بی بی بائی سے آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کی ساس جنت بی بی[3] نے رنگ برنگے قیمتی ملبوسات دلہن کی نذر کئے۔ تمام امیروں کبیروں نے نذریں گزاریں۔ حضرت سخی سرور شادی کی رسوم سے فارغ ہو کر دلہن کی ڈولی اپنے گھر لے آئے۔ آپ کی والدہ مائی عائشہ نے گھی کے چراغ جلائے اور خوب خوشیاں منائیں۔

خالہ زاد بھائیوں کی عداوت

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہکوٹ کے نمبردار پیرا دھان کی صرف دو لڑکیاں تھیں اور کوئی

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو: خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۵۔ تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۲-۲۰۴۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۶۔ LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P312-15 وغیرہ۔

[2] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۲-۲۰۴۔

[3] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۹۔ بعض جگہوں پر حضرت سخی سرور کی ساس کا نام زینت خاتون تحریر ہے۔ مثلاً دیکھیں: (LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL II, P 130.

بیٹا نہیں تھا۔ ان لڑکیوں میں سے بڑی یعنی عائشہ[1] کی شادی حضرت سخی سرور کے والد حضرت زین العابدین سے ہوئی تھی اور چھوٹی یعنی رابعہ[2] کا نکاح کھوکھر قوم کے ایک فرد سے کیا گیا تھا۔ بی بی عائشہ سے سیّد احمد سلطان یعنی حضرت سخی سرور اور سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا یا خان جٹی پیدا ہوئے۔ بی بی رابعہ کے بطن سے ابی۔ جودھا۔ ساون۔ لگو اور مکو کی ولادت ہوئی[3]۔ پیرا رھان کی شاہکوٹ میں کافی زمینیں تھیں۔ جب اس کا انتقال ہوا تو حضرت سخی سرور کے خالہ زاد بھائیوں نے زمین کو اس طرح تقسیم کیا کہ زرخیز علاقے تو اپنے پاس رکھ لئے اور بنجر علاقے حضرت سخی سرور کے حوالے کر دیئے۔ لیکن عنایت ایزدی سے آپ کی بنجر زمین بھی زرخیز ہو گئی۔ اس پر خالہ زاد بھائی بڑے کبیدہ خاطر ہوئے اور اس موقع کی تاک میں رہنے لگے کہ کسی طرح آپ کو نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے حاکم تک معاملہ پہنچایا لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہر جگہ آپ کو کامیابی نصیب ہوئی اور جب حاکم نے اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کر دی تو خالہ زاد بھائیوں پر قیامت گزر گئی۔ وہ آپ سے سخت ناراض ہو گئے اور دل ہی دل میں آپ کو تنگ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ چنانچہ جب آپ اپنی زوجہ کو لے کر گھر آئے تو خالہ زادوں نے اپنے نانا مرحوم، پیرا رھان، کے لاگیوں کو بہکا کر آپ کے پاس بھیجا۔ ان سے کہا کہ تم کو چاہیے کہ سیّد احمد کو بدنام کر کے آؤ۔ لاگیوں نے پوچھا: وہ کس طرح۔ انھوں نے کہا: اس طرح کہ تم جا کر ان سے مطالبات کرو۔ اگر وہ سیر دیں تو سوا سیر مانگو۔ من دیں تو دو من طلب کرو۔ اور نہ دے سکیں تو خوب بدنام کرو۔

لاگیوں نے خالہ زادوں کے کہنے پر حضرت سخی سرور کے گھر کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر لاگ طلب کیا۔ حضرت زین العابدین نے بے شمار دولت اور گھوڑے جوڑے ان میں تقسیم کر دیئے وہ نہال ہو کر لوٹ گئے۔ جب خالہ زادوں نے یہ ماجرا دیکھا تو بہت شرمندہ ہوئے لیکن ان کے دل میں حسد کی آگ تیزی سے بھڑک اٹھی۔

مختصر یہ کہ خالہ زاد بھائیوں کو قدم قدم پر ناکامی ہوئی لیکن وہ باز نہ آئے اور آخر اپنے

[1،2،3] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۰۹-۲۱۱

گھٹیا ارادوں میں کامیاب ہوئے۔ حضرت سخی سرور کو انھیں کے ہاتھوں شہادت کا جام پینا پڑا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مؤلف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں[1] کہ گھنو خاں کی صاحبزادی بی بی بائی سے شادی کے کچھ عرصہ بعد حضرت سخی سرور کے والد ماجد، حضرت سید زین العابدین کا انتقال ہو گیا[2]۔ بعد ازاں آپ کی والدہ ماجدہ، مائی عائشہ اور سوتیلے بھائیوں میں سید محمود اور سید سہرا، یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ ان کے مزارات شاہکوٹ میں واقع ہیں اور زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔

دوسری شادی

بعض کتابوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور نے مذکورہ شادی کے علاوہ ایک اور شادی بھی کی تھی۔ دونوں میں کون سی شادی پہلے ہوئی تھی اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایچ۔ اے روز[3] اور ایڈورڈ مکلیگن[4] نے لکھا ہے کہ حضرت سخی سرور نے اپنے گاؤں شاہکوٹ میں سید عبدالرزاق بخاری کی لڑکی سے بھی شادی کی تھی۔ ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے آپ کے سوانح حیات پر جو کتابچہ شائع کرایا ہے اس میں بھی یہی کچھ مرقوم ہے[5]۔ اس میں مزید اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ سید

۱ھ تحقیقات چشتی، ص ۲۱۰

۲ھ ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت زین العابدین کا انتقال ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰ء سے کچھ پہلے ہوا تھا۔ (کتاب ہذا، ص ۱۳۱ - نیز دیکھیں کتاب ہذا، ص ۱۸۷)۔ اس لحاظ سے حضرت سخی سرور کی بی بی بائی سے جو شادی ہوئی اس کے زمانے کا تعین چنداں مشکل نہیں۔ تخمیناً یہ شادی ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰ء سے دو ایک سال قبل ہوئی ہوگی۔

۳ھ GLOSSARY, VOL 1, P 567.

۴ھ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 133.

۵ھ سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۱۷۔

عبدالرزاق کی لڑکی سے حضرت سخی سرور کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام معراج دین رکھا گیا۔

باطنی تعلیم

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت سخی سرور نے ظاہری علوم کی تکمیل لاہور میں مولوی محمد اسحاق کے پاس کی تھی[1] آپ کے دل میں ظاہری علوم کی تحصیل کے علاوہ باطنی علوم کو اکتساب کرنے کی بھی شدید خواہش تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ وقتاً فوقتاً اپنے والد سے راہنمائی حاصل کرتے رہے۔ آپ کے والد نے آپ کی پرورش ابتدا ہی سے اس طرح کی جس طرح کوئی پیر اپنے مرید کی تربیت کرتا ہے۔ اس قسم کی پرورش اور تربیت کا ذکر ہمیں فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے۔ ان کے والد نے بھی ان کی تربیت ایسے ہی کی تھی جیسے ایک مُرشد اپنے مرید کی کرتا ہے۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، حضرت سخی سرور کو باطنی تعلیم کے حصول کا بے حد شوق تھا لیکن انھیں ایسا موقع میسّر نہ آیا تھا کہ اس شوق کو خاطر خواہ پروان چڑھا سکتے۔ آپ ہر وقت اس موقع کے متلاشی رہتے تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد آپ کو اپنے وطن شاہکوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سارا گاؤں آپ کو سونا سونا دکھائی دینے لگا۔ بقول غالب:

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

والد کی وفات اور عزیزوں کی اموات نے آپ کا دل وطن سے اچاٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ خالہ زاد بھائیوں کی بے مروتی اور چیرہ دستی کو دیکھ کر آپ مجبور ہو گئے کہ وطن سے کہیں دور چلے جائیں۔ لہٰذا آپ کو باطنی علوم کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ آپ شاہکوٹ سے کیا نکلے برصغیر پاک و ہند سے ہی دور چلے گئے۔ راستے میں کہیں نہ رُکے، سیدھے بغداد پہنچ کر دم لیا[2] ان دنوں

---

[1] کتاب ہذا، ص ۱۳۹ - ۱۴۰

[2] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132. / GLOSS, VOL 1, P 567.

بغداد روحانی علوم کا سرچشمہ تھا۔ دور دور سے ان علوم کے متوالے کشاں کشاں وہاں پہنچتے۔ حضرت سخی سرور بھی اپنی روحانی تشنگی کو مٹانے کے لئے وہاں جا پہنچے۔

حضرت سخی سرور پیران پیر کے حضور میں

بغداد پہنچ کر حضرت سخی سرور، پیران پیر کے حضور میں باریاب ہوئے اور روحانی تعلیم حاصل کی۔ پیرانِ پیر سلسلہ قادریہ کے سرخیل تھے۔ لہٰذا حضرت سخی سرور نے ان کی صحبت سے اس سلسلہ میں اکتساب فیض کیا اور جب وہاں سے وطن کو واپس آئے تو اپنے ہمراہ سلسلہ قادریہ بھی لائے۔ لیکن جیسا کہ تیسرے باب میں ذکر آچکا ہے آپ نے اپنے بعد کوئی خلیفہ نہیں چھوڑا۔ اس لئے اس سلسلہ کو آپ سے فروغ حاصل نہ ہو سکا۔

پیران پیر سے حضرت سخی سرور کی ملاقات کا ذکر تذکروں میں بڑے دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ایم میکالف لکھتے ہیں[۱] کہ حضرت سخی سرور پیران پیر کے مقلدوں میں سے تھے۔ پیران پیر جیلان کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ان سے ملنے کے لئے بغداد پہنچے۔ خواجہ صاحب سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے اور پاک و ہند کی روایات کے زیر اثر موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن پیرانِ پیر سلسلہ قادریہ کے سرگروہ ہونے کی وجہ سے موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے بلکہ اس سے متنفر تھے۔ چنانچہ انھوں نے سماع کو اپنے مسلک اور اپنے پیروؤں کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ جن دنوں خواجہ صاحب پیرانِ پیر کی خدمت میں پہنچے حضرت سخی سرور مؤخر الذکر کے خدمتگار کی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ پیرانِ پیر نے آپ کو خواجہ صاحب کی خاطر مدارت پر مقرر کر دیا۔ جب آپ خواجہ صاحب کی تواضع کے لئے نہایت نفیس اور عمدہ کھانوں پر مشتمل خوان لے کر پہنچے تو خواجہ صاحب نے یہ نہ جانتے ہوئے کہ پیرانِ پیر نے موسیقی پر بندش لگا رکھی ہے، کھانا دیکھ کر

---

[۱] CALCATTA REVIEW, VOL LX(60), 1875, P78. ، نیز دیکھیں:

NORTH INDIAN NOTES AND QUERIES, VOL II, NO II, FEB, 1893, P182.

کہا کہ نان ہست ولی بی نمک است۔ یعنی کھانا تو ہے لیکن بے نمک اور پھیکا ہے۔ اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ دعوت کا انتظام تو بہت اچھا ہے لیکن سماع یعنی گانے بجانے کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ حضرت سخی سرور، خواجہ صاحب کا مدعا سمجھ گئے۔ فوراً اپنے آقا اور مرشد کو خبر کی پیران پیر نے یہ سوچ کر کہ مہمان کی خواہش کا احترام کرنا انسانی اور اخلاقی فرض ہے۔ اپنے مسلک کی روایات کے برخلاف ایک سھرند یعنی سازندہ کو بلا بھیجا۔ اس نے فارسی کی ایک غزل نہایت اچھی آواز میں گا کر سنائی۔ اس سے خواجہ صاحب کے قلب و ذہن کو قدرے سکون ملا اور ساتھ ہی میزبان کی تواضع بھی مکمل ہوگئی۔ حضرت سخی سرور بھی خواجہ صاحب کی قیامگاہ کے قریب کہیں موجود تھے۔ آپ کے کان بھی سماع کی طرف متوجہ ہوگئے۔

جب خواجہ صاحب، پیران پیر سے رخصت ہو کر بغداد سے روانہ ہوئے تو حضرت سخی سرور نے اپنے مرشد کے روبرو پیش ہو کر عرض کیا کہ یا حضرت! مجھ سے مسلک کی بے قاعدگی ہوئی ہے کیونکہ میں نے سازندہ کی آواز سن لی ہے۔ لہٰذا میں معذرت کا طلبگار ہوں۔ پیران پیر کی نظر میں یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ آپ کے مسلک کی خلاف ورزی کی گئی تھی اور ایک ایسے شخص سے یہ اصول شکنی ہوئی تھی جو آپ کے خاص الخاص مریدوں میں سے تھا۔ آپ کو اس مرید کے مثالی تقدس اور بے پناہ جوش عقیدت کی طرف سے پورا پورا اطمینان تھا۔ لیکن اب اسی سے ایسا جرم سرزد ہوا تھا جس کی معافی ناممکن تھی۔ تاہم انھوں نے حضرت سخی سرور کو ایک رقعہ خواجہ صاحب کے نام دیا، جن کی تواضع کے لئے موسیقی کا انتظام کیا گیا تھا۔ رقعہ میں یہ درخواست کی گئی کہ حضرت سخی سرور کے حق میں خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔

حضرت سخی سرور اپنے روحانی مرشد پیران پیر کا رقعہ لے کر اجمیر شریف پہنچے اور رقعہ خواجہ صاحب کو دیا۔ خود خواجہ صاحب اور ان کے خاص مریدوں نے آپ کے حق میں دعا کی اور خواجہ صاحب نے اپنے طور پر آپ کو معاف کر دیا لیکن معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ چونکہ حضرت سخی سرور سے مسلک قادریہ کے سب سے بڑے اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہے اس لئے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور باقی رہنی چاہئے جو اصول کی اس خلاف ورزی کو یاد دلاتی رہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے آپ سے کہا کہ جاؤ تمھیں معاف کر دیا گیا لیکن اصول شکنی

کی وجہ سے تمہاری قبر پر ہمیشہ ڈھول تاشے بجائے جائیں گے۔ حضرت سخی سرور خواجہ صاحب سے رخصت ہو کر اجمیر سے نکلے۔ واپسی پر آپ نے پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کی سیر و سیاحت کی اور بالآخر کوہ سلیمان کے دامن میں اس جگہ توطن اختیار کیا جو آج کل آپ کے نام پر سخی سرور کہلاتی ہے۔

حضرت سخی سرور شیخ الشیوخ کی خدمت میں

تیسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت سخی سرور نے بغداد میں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے بھی روحانی فیض پایا تھا۔ کم و بیش تمام تذکروں اور کتابوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے[۱] لیکن جو حکایتیں یا روایتیں پیرانِ پیر اور خواجہ مودود چشتی سے آپ کی ملاقات کے متعلق مشہور ہیں، شیخ الشیوخ سے وابستہ نہیں دکھائی دیتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ نے سلسلہ سہروردیہ میں شیخ الشیوخ سے استفادہ کیا اور ان سے یہ سلسلہ لے کر پاک و ہند میں تشریف لائے لیکن چونکہ آپ کے جانشینوں میں ایسا کوئی باقی نہ رہا جو آپ کے بعد اس سلسلے کی ترویج و اشاعت کے لئے کوشاں ہوتا اس لئے یہ سلسلہ بھی سلسلہ قادریہ کی طرح آپ سے فروغ نہ پا سکا۔ اس کو پھیلانے والے ایک اور بزرگ نمودار ہوئے جو صوفیا کی تاریخ میں شیخ بہاالدین زکریا ملتانی کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے بھی حضرت سخی سرور کی طرح شیخ الشیوخ سے براہِ راست خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ آپ کے پیر بھائی کہے جا سکتے ہیں۔ ان کا ضمناً ذکر تو پہلے گزر چکا ہے لیکن تفصیل سے صوفیائے معاصر کے باب میں آئے گا۔ سلسلہ سہروردیہ میں حضرت سخی سرور کا روحانی شجرہ بطریق ذیل مرتب ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ۔ خواجہ حسن بصری، خواجہ عبدالواحد۔ خواجہ فضیل

---

[۱] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۶۔ آب کوثر ص ۹۱۔ چشمۂ کوثر، ص ۱۸۔ الفقر فخری، ص ۷۲۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۶۔ عرس اور میلے، ص ۸۹۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P132. GLOSSARY, VOL 1, P567.

بن عیاض - حضرت ابراہیم بن ادہم - حضرت حذیفہ المرعشی - حضرت ہبیرۃ البصری - شیخ ممشاد علو دینوری - شیخ اسود احمد دینوری - شیخ ابو عبداللہ - شیخ وجیہہ الدین سہروردی شیخ ابو نجیب سہروردی - شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی - حضرت سخی سرور -

حضرت سخی سرور خواجہ مودود چشتی کی بارگاہ میں

خزینۃ الاصفیا کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے[1] حضرت سخی سرور بغداد میں غوث اعظم اور شیخ الشیوخ کی صحبت سے فیض اُٹھا کر چشت پہنچے - وہاں آپ نے خواجہ قطب الدین مودود کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی - اس سلسلے میں آپ کے روحانی شجرہ کی ترتیب یوں قرار پائی ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم - حضرت علی کرم اللہ وجہہ - خواجہ حسن بصری - خواجہ عبدالواحد - خواجہ فضیل بن عیاض - حضرت ابراہیم بن ادہم - حضرت حذیفہ المرعشی - حضرت ہبیرۃ البصری - شیخ ممشاد علو دینوری - خواجہ ابو اسحاق شامی چشتی - خواجہ ابو احمد ابدال چشتی - خواجہ ابو محمد زاہد مقبول چشتی - خواجہ ابو یوسف ناصر الدین چشتی - خواجہ قطب الدین مودود چشتی - حضرت سخی سرور -

چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے مشائخ کے ناموں اور ان کی ترتیب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں سلسلے شیخ ممشاد علو دینوری تک ایک ہی تھے - ان کے بعد ان کی شاخیں الگ الگ ہو گئیں - حضرت سخی سرور نے سلسلہ چشتیہ میں خواجہ مودود چشتی کی صحبت سے فیض اُٹھایا اور انہی کے دستِ مبارک سے خرقہ خلافت حاصل کیا - خزینۃ الاصفیا کے مطابق[2] پھر آپ کے اندر اتنی اہلیت اور صلاحیت پیدا ہو گئی کہ آپ رجال الغیب اور حضرت خضر سے گفتگو کر سکتے تھے اور ابدال و اوتاد میں سے جس کو اپنے پاس بلانا چاہتے وہ حاضر ہو جاتا - غرض آپ ولی کامل بن گئے اور آپ سے خارق عادت افعال یا کرامات کا ظہور ہونے لگا -

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹ - ج دوم، ص ۲۴۵ - ۲۴۶

[2] ایضاً

جس طرح پیران پیر سے حضرت سخی سرور کے تعلق کی بابت کچھ افسانوی روایتیں کتابوں میں مندرج دکھائی دیتی ہیں اسی طرح خواجہ مودود کے ساتھ آپ کے ارتباط کی نسبت بھی کچھ دلچسپ حکایتیں ملتی ہیں۔ مثلاً عبداللہ خویشگی اپنی کتاب معارج الولایت میں لکھتے ہیں[1] کہ سلطان سرور[2] جو پیر خانو یا پیر کانو یا پیر کانون کے لقب سے مشہور ہیں اور لنبھا[3] نامی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے، برصغیر پاک و ہند کے باکمال مشائخ میں سے ہیں۔ بعض ملفوظات میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ حضرت خواجہ مودود چشتی کے مریدوں میں سے ہیں۔ لیکن ابتدائے حال میں آپ صرف ایک چور تھے۔

مختصر یہ کہ حضرت سخی سرور بغداد میں غوث اعظم اور شیخ الشیوخ کی صحبت بابرکات سے اخذِ فیض کر کے چشت پہنچے اور وہاں خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے برصغیر پاک و ہند تشریف لائے۔ یہاں آکر آپ نے مؤلف خزینۃ الاصفیا کے مطابق[4] لاہور قیام کیا اور مولوی محمد اسحاق سے علوم ظاہری کی تحصیل کی، جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے[5]۔ بعض کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ بغداد سے واپسی پر حضرت سخی سرور پہلے

---

[1] معارج الولایت (مجموعہ شیرانی قلمی)، ص ۴۱۸۔ (مجموعہ آذر قلمی)، ص ۵۲۸۔

[2] یعنی سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور۔

[3] تحقیق کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لنبھا نام کا گاؤں کہاں واقع تھا۔ معارج الولایت کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی حضرت سخی سرور کو لنبھ سے نسبت دی گئی ہے۔ (مثلاً دیکھیں: LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL ,P) لیکن وہاں بھی حقیقتِ حال مضمر ہی رہی۔ قیاس چاہتا ہے کہ لنبھا یا تو شاہکوٹ کا قدیم نام ہوگا یا پھر سخی سرور واقع ڈیرہ غازی خاں کو اگلے وقتوں میں اس نام سے پکارتے ہوں گے۔ سخی سرور کا ایک قدیم نام نگاہہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نگاہہ سے پہلے لنبھا اس جگہ کا نام ہو اور بمرور ایام لنبھا سے نگاہہ اور نگاہہ سے سخی سرور ہو گیا ہو۔

[4] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۱۰۹۔ ج دوم، ص ۲۴۵

[5] کتاب ہذا، ص ۱۳۹۔ ۱۴۰

دھونکل گئے تھے[1]۔ بہر کیف اتنا ضرور ہے کہ آپ نے لاہور میں بھی قیام کیا تھا اور دھونکل میں بھی۔ اس کے علاوہ آپ سوہدرہ اور رتی وغیرہ بھی گئے تھے۔ یہ سب دیہات تقریباً وزیر آباد اور گوجرانوالہ کے آس پاس واقع ہیں۔ آپ نے بغداد سے واپس آکر پہلے کدھر کا رخ کیا، یہ بحث کچھ بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ ذیل میں فرداً فرداً ان مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں آپ نے بغداد سے مراجعت کے بعد قیام کیا تھا۔

سوہدرہ میں قیام

خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے[2] کہ حضرت سخی سرور بغداد سے واپس آئے تو پہلے لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہاں پر علوم ظاہری کی تکمیل کرنے کے بعد سوہدرہ[3] تشریف لے گئے، جو لاہور سے ساٹھ ستر میل

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES , P 132. ، GLOSSARY , VOL I , P 567.
LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P 307. - ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور نے گھنو خان، حاکم ملتان اور سید عبد الرزاق کی لڑکیوں سے جو شادیاں کی تھیں وہ بغداد سے واپس آ کر کی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بغداد اپنے والد، حضرت زین العابدین، کی وفات کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی میں گئے تھے کیونکہ گھنو خان، حاکم ملتان کی صاحبزادی بی بی بائی سے آپ کی جو شادی ہوئی اس میں آپ کے والد شریک تھے۔ چنانچہ آپ کے والد اس شادی کے بعد کسی وقت فوت ہوئے ہوں گے۔ اگر یہ مان لیں کہ آپ اپنے والد کی وفات ہی کے بعد بغداد گئے تھے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آپ کی شادیاں بغداد جانے سے قبل ہوئی تھیں۔ یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کی شادی سے متعلق جو روایتیں مشہور ہیں، ان میں غلطی سے آپ کے والد کی شمولیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہر کیف واقعات اتنے متضاد اور متخالف ہیں کہ ایک کو صحیح مانتے ہیں تو دوسرا غلط ہو جاتا ہے اور دوسرے کو تسلیم کرتے ہیں تو تیسرے میں غلطی پیدا ہو جاتی ہے

[2] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۲۔ ج دوم، ص ۲۴۶۔ نیز دیکھیں آبِ کوثر، ص ۹۱۔ چشمہ کوثر ص ۸۱۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۷۔ عرس اور میلے، ص ۸۹۔

[3] یہ چھوٹا سا شہر یا قصبہ وزیر آباد۔ سیالکوٹ روڈ پر واقع ہے۔ اور وزیر آباد سے اس کا فاصلہ تین

کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف، وزیر آباد کے متصل واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے دریائے چناب کے کنارے اپنا ڈیرہ جمایا۔ آپ شب و روز یادِ الٰہی اور ہدایتِ خلق میں مشغول رہتے تھے۔ نواحی علاقوں میں آپ کی ولایت کا چرچا ہوا تو گروہ کے گروہ فیض حاصل کرنے کے لئے آپ کے پاس آنے لگے۔ عقیدت مندوں کا سلسلہ جلد ہی وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ بے اندازہ روپیہ آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ لایا جاتا لیکن آپ سارے کی ساری رقم غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے اور پھوٹی کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ خدا نے آپ کو بڑی قبولیت عطا کی تھی۔ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آتے لیکن کوئی ناکام اور نامراد نہ جاتا۔ آپ گویا شمعِ معرفت تھے اور عقیدت مندوں کا ہجوم پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہوتا اور اپنی مراد حاصل کر کے روانہ ہوتا۔ یہی وہ دور ہے جس میں آپ نے اپنی غریب پروری کا مظاہرہ کیا اور سخاوت کے ایسے دریا بہائے کہ لوگ آپ کو سلطان سخی سرور اور لکھ داتا کہہ کر پکارنے لگے۔

ارمان سرحدی رقمطراز ہیں[1] کہ جب تک حضرت سخی سرور سوہدرہ میں اقامت پذیر رہے خلقِ خدا آپ کی روحانی تعلیمات سے برابر بہرہ اندوز ہوتی رہی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔

دھونکل میں ورود

حضرت سخی سرور کے متعلق بعض سوانح نگاروں خصوصاً ایچ۔ اے روز[2] اور

یا پانچ میل ہے۔ ساری سڑک پکی ہے۔ کہتے ہیں اس کی بنیاد سلطان محمود غزنوی کے ایک مشہور و معروف غلام ایاز نے رکھی تھی۔ کسی زمانے میں اس کے سو دروازے تھے، اسی نسبت سے اس کو سوہدرہ (سو درہ) یعنی سو دروازوں والا شہر) کہتے ہیں۔ یہاں پر مغل فن تعمیر کے بہت سے نمونے تھے جو آج بھی کھنڈرات کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مغلوں کے زوال کے بعد سوہدرہ پر سکھوں نے قبضہ جما لیا تھا (دیکھیں CENSUS REPORT GUJRANWALA, P 1-23)۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: GAZETTEER GUJRANWALA 1893-94, P 180، اور تاریخ گوجرانوالہ، ص ۳۱

[1] عرس اور میلے، ص ۸۹۔

[2] GLOSSARY, VOL 1, P 568.

ایڈورڈ مکلیگن[1] نے لکھا ہے کہ حضرت سخی سرور لاہور میں مولوی محمد اسحاق سے ظاہری علوم کی تکمیل کر کے دھونکل تشریف لے گئے، جو ضلع گوجرانوالہ میں وزیر آباد کے قریب واقع ہے۔
منشی گوپال داس نے تاریخ گوجرانوالہ میں لکھا ہے[2] کہ دھونکل کا اصل نام دھرکیل ہے سلطان محمود غزنوی کے عہد میں یہاں ایک راجہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے اس جگہ ایک قلعہ بنوایا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی حکومت ضعیف ہوگئی اور قلعہ منہدم ہوگیا۔ اس قلعہ کے نشانات اب تک دھونکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب قلعہ تیار ہو رہا تھا، بعض لوگوں نے اپنے گھر بھی اس قلعہ کے آس پاس بنوا لئے تھے جس کی وجہ سے اچھا خاصا ایک گاؤں بن گیا۔ اس گاؤں کا نام دھرکیل مقرر ہوا۔ اختلاف السنہ سے اس کی اصلیت بگڑ گئی اور دھونکل مشہور ہوگیا۔ راجہ دھرکیل کی حکومت کے ضعف سے گاؤں بھی ویران ہوگیا۔ اس قلعہ اور گاؤں کی ویرانی کے بعد سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور اس جگہ تشریف لا کر مصروف عبادت ہوئے۔ آپ کی برکت سے یہاں پانی کا ایک چشمہ جاری ہوگیا۔ شاہ جہان کے زمانے میں مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی[3] نے آپ کے عبادت خانہ پر ایک پختہ مسجد بنوائی اور چشمہ کی جگہ کنواں تیار کرایا۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پانی کی حفاظت کے لئے اس کنوئیں پر ایک گنبد تعمیر کرایا۔ حضرت سخی سرور کی عبادت گاہ پر ہر سال ہاڑ کے مہینے کی پہلی جمعرات سے ساون کے مہینے کی پہلی جمعرات تک ایک میلہ لگتا ہے جس میں اطراف ملک کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔[4] اس میلہ کی تفصیل

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 133.

[2] تاریخ گوجرانوالہ، ص ۳۳

[3] عہد شاہجہانی کا ایک بلند پایہ عالم جس نے مختلف علوم خصوصاً حدیث اور تفسیر پر بیسیوں کتابیں لکھیں۔ اس پر مفصل نوٹ آگے آئے گا۔ (ملاحظہ ہو کتاب ہذا، ص)

[4] خلاصۃ التواریخ میں مرقوم ہے کہ دھونکل میں ایک جگہ سلطان سخی سرور کے نام سے منسوب ہے۔ یہ جگہ اگرچہ ہمیشہ زیارت گاہ خلائق رہتی ہے لیکن موسم گرما میں برصغیر پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے لوگ جوق در جوق یہاں آتے اور نذریں گزارتے ہیں۔ کوئی دو مہینے تک اس جگہ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ (دیکھیں خلاصۃ التواریخ ص ۳۵)

اپنے مقام پر آئے گی۔

گوجرانوالہ کی رپورٹ مردم شماری میں بھی کچھ اس قسم کی باتیں درج ہیں۔ اس میں لکھا ہے[1] کہ دھونکل ایک تاریخی مقام ہے جس کو سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں راجہ دھرکیل نے قائم کیا تھا۔ پنجاب کے مشہور بزرگ حضرت سخی سرور چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی میں یہاں تشریف لائے۔ آپ کی کرامت سے پانی کا ایک چشمہ جاری ہوا جو کوڑھ کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ جس جگہ آپ نے یہاں پر عبادت کی تھی اس کو شاہجہان کے عہد میں ایک عظیم الشان دربار میں منتقل کر دیا گیا اور اس چشمے کو جس پر ایک کنواں تعمیر کر دیا گیا تھا، دلکش اور نظر افروز بنا دیا گیا۔ دھونکل میں ہر سال جون جولائی کے مہینے میں ایک بڑا میلہ آپ کی یاد میں لگتا ہے۔ دھونکل کا قصبہ وزیر آباد سے کوئی تین میل کے فاصلے پر واقع ہے اور آج کل ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ پہلے حضرت سخی سرور کے دربار کا چڑھاوا اٹھائیس کنوؤں کے مالکوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دربار محکمہ اوقاف کی تحویل میں آچکا ہے اور اس کا نظم وضبط اسی محکمے کے سپرد ہے۔

حضرت سخی سرور کے قیام دھونکل سے متعلق کئی ایک واقعات مختلف کتابوں میں درج ہیں۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے[2] کہ ایک دن دھونکل کا نمبردار، جو ندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یا حضرت میرا لڑکا دھونکل، جس کے نام پر میں نے یہ گاؤں آباد کیا ہے، چند روز سے مفقود الخبر ہے۔ براہِ کرم دعا کیجئے کہ وہ میرے پاس آجائے۔ آپ نے کہا: جاؤ اور اطمینان رکھو۔ لڑکا انشاء اللہ تعالیٰ آج تمہارے پاس آجائے گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ لڑکا اسی روز باپ کے پاس آگیا۔

وطن کو واپسی

مفتی غلام سرور رقمطراز ہیں[3] کہ حضرت سخی سرور چند سال دھونکل میں مقیم رہے اور اسی

---

[1] DISTRICT CENSUS REPORT GUJRANWALA, 1961, P.22-23

[2] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۲ - ج دوم، ص ۲۴۶

[3] ایضاً ، ایضاً، ص ۲۴۸

دوران لوگوں میں ارشاد و تلقین فرماتے رہے۔ بعد ازاں آپ پر وطن کی محبت غالب آئی اور آپ سیدھے کرسی کوٹ پہنچے[1] جو آج کل شاہکوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے سیّد عبدالرزاق کی دختر نیک اختر سے شادی کی جس کے بطن سے کوئی دو سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سراج الدین رکھا گیا۔ یہیں آپ نے گھنو خان پٹھان، حاکم ملتان، کی صاحبزادی بی بی بائی سے بھی نکاح کیا۔ ان شادیوں کا تفصیلی ذکر پہلے آچکا ہے[2] ذرا آگے چل کر مفتی غلام سرور بیان کرتے ہیں[3] کہ اپنے وطن میں آپ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بہت سے لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور آپ کی شہرت برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ آپ کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کے پیشِ نظر آپ کے خالہ زاد بھائیوں کی پرانی دشمنی تازہ ہو گئی۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں رہنے لگے کہ کس طرح آپ کا کام تمام کر دیا جائے لیکن بایں ہمہ تحقیقاتِ چشتی کے مطابق[4] آپ کئی سال اپنے وطن میں اقامت پذیر رہے۔ اور اس

---

[1] یہاں پر شیخ اکرام کو کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سخی سرور کئی سال دھونکل میں اقامت پذیر رہے۔ اس کے بعد وطن کی محبت دامن گیر ہوئی اور آپ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں میں جسے اب شاہکوٹ کہتے ہیں، واپس تشریف لے گئے۔ (دیکھیں آب کوثر، ص ۹۱۔ چشمۂ کوثر ص ۸۱)۔ اعجاز قدوسی نے بھی یہی کچھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سخی سرور دھونکل سے روانہ ہو کر ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں کھری کوٹ میں تشریف لے گئے جو آج کل شاہکوٹ کہلاتا ہے (تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی غلام سرور نے جس شاہکوٹ کا ذکر کیا ہے، ہماری تحقیق کے مطابق اس کا اصل نام سکوٹ ہے۔ جو ملتان سے گیارہ، بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی شاہکوٹ آپ کا وطن مالوف تھا۔ آپ دھونکل سے روانہ ہو کر اسی شاہکوٹ میں آئے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں نہیں گئے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں کو روانگی بعد کا واقعہ ہے۔ یعنی شاہکوٹ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد آپ ڈیرہ غازی خاں تشریف لے گئے تھے۔

[2] دیکھیں کتاب ہذا ص ۱۵۸ - ۱۶۴

[3] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۲ - ج دوم، ص ۲۴۸-

[4] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۰

دوران لوگوں میں مذہب اور دین کی تبلیغ کرتے رہے۔ تاآنکہ آپ کے والد، حضرت زین العابدین والدہ بائی عائشہ اور سوتیلے بھائیوں میں سیّد محمود اور سید سہرا یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ ان کے مزارات شاہکوٹ ہی میں واقع ہیں اور اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔

موضع نگاھہ کو ہجرت

مولوی نور احمد لکھتے ہیں[۱] کہ جب خالہ زاد بھائیوں کی عداوت حد سے تجاوز کر گئی تو آپ نے ہجرت کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ تقریباً سارے عزیز ایک ایک کر کے وفات پا چکے تھے[۲]۔ اب آپ کو وطن سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی لہٰذا اسے خیر باد کہہ کر ڈیرہ غازی خان روانہ ہوئے۔ اور کوہِ سلیمان کے دامن میں اس جگہ اپنا ڈیرہ جمایا جہاں آج کل آپ کا مزار ہے[۳]۔ یہ جگہ پہلے نگاہہ[۴] کہلاتی تھی لیکن بعد میں سخی سرور کے نام سے موسوم ہوئی۔ مولوی نور احمد کا بیان ہے

۱؎ تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۰-۲۱۱

۲؎ ایچ۔ اے روز اور ایڈورڈ میکلیگن نے حضرت سخی سرور سے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں سے ایک کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور، ڈیرہ غازی خان، اپنے والد حضرت زین العابدین کے حکم سے تشریف لے گئے تھے تاکہ اس دور افتادہ جگہ میں قیام کر کے لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھائیں۔ (ملاحظہ ہو GLOSSARY, VOL 1, P 567. PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سخی سرور کے والد حضرت زین العابدین اس وقت بھی بقیدِ حیات تھے جبکہ آپ ڈیرہ غازی خان گئے تھے۔ اس لحاظ سے عین ممکن ہے کہ آپ کے والد آپ کی وفات (۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء) کے بعد کسی وقت فوت ہوئے ہوں۔ منشی حکم چند نے آپ کے والد کا سال وفات ۵۹۷ھ درج کیا ہے۔ (تواریخ ملتان ص ۹۰)۔ اگر مذکورہ روایت کو صحیح مان لیں تو اس کی روشنی میں آپ کے والد کا یہ سال وفات کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۳۔ ج دوم، ص ۲۴۸

۴۔ ایم میکالف لکھتے ہیں کہ نگاہہ کا موجودہ نام سخی سرور ہے۔ (CALCATTA REVIEW, VOL LXXIII, 1881, P 253.) بعض کتابوں میں نگاہہ کی بجائے صرف نگاہ مرقوم ہے۔ (مثلاً دیکھیں تحقیقاتِ

کہ[1] آپ شاہکوٹ سے نکل کر سیدھے نگاہہ پہنچے جو ملتان سے کوئی ساٹھ کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں آگے جنگل تھا لیکن اب شہر بستا ہے۔ مفتی غلام سرور لکھتے ہیں کہ[2] شاہکوٹ سے ہجرت کے وقت آپکے ہمراہ آپ کی اہلیہ محترمہ، بی بی بائی[3] آپ کے صاحبزادے سید سراج الدین جو سیّد راج کے نام سے بھی مشہور ہیں، اور آپ کے حقیقی بھائی سیّد عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا[4] تھے۔

چشتی، ص ۲۱۰) لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ کی صحیح املا نگاہہ ہی ہے۔ چنانچہ حسن قتیل نے لکھا ہے کہ پنجاب کے ہندو حضرت سخی سرور سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ کا مزار ملتان کے قرب وجوار (مراد ڈیرہ غازیخاں) میں ایک گاؤں کے اندر واقع ہے، جو نگاہہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں لفظ نگاہ کے آگے ایک ہائے ہوز بھی ہے (ملاحظہ ہفت تماشائے قتیل، ص ۸۹۔ اور دربار ملّی، ص ۳۵۶)

[1] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۰

[2] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۳۔ ج دوم، ص ۲۴۸

[3] اب آپ کے ساتھ آپ کی دوسری بیوی بھی تھی یا نہیں؟ اس مسئلے پر کم وبیش تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں صرف ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے لکھا ہے کہ جب آپ شاہکوٹ سے نگاہہ تشریف لے گئے تو آپ کے ہمراہ آپ کی دونوں بیویاں تھیں۔ یعنی گھنو خان پٹھان، حاکم ملتان کی صاحبزادی، بی بی بائی بھی اور سیّد عبدالرزاق کی دختر نیک اختر بھی۔ ملک غوث نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے چار ساتھی بھی تھے جو عرف عام میں چار یار کہلاتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: میاں نور۔ میاں محمد اسحاق۔ میاں عثمان اور میاں علی۔ (دیکھیں سوانح حیات حضرت سخی سرور) ص ۲۲

[4] مولوی نور احمد نے بھی خان ڈھوڈا کی ہمراہیت کا ذکر کیا ہے۔ (تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۰) لیکن ایچ اے روز اور ایڈورڈ مکلیگن لکھتے ہیں کہ حضرت زین العابدین کے دو لڑکے تھے۔ ایک سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور اور دوسرے سید عبدالغنی المشہور خان ڈھوڈا۔ موخرالذکر کو کوئی شہرت حاصل نہ تھی۔ وہ بغداد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ (PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132 - GLOSSARY, VOL 1, P 567.) ملک غوث نے لکھا ہے کہ سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا کو پریاں اٹھا کر غزنی میں لے گئیں تھیں۔ ان کا مزار بھی وہیں ہے۔ (سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۲۲)

آپ کا خیال تھا کہ چونکہ ہم نے اپنا تمام اثاثہ شاہکوٹ میں چھوڑ دیا ہے اور زمینوں سے قطع تعلق کر لیا ہے جو خالہ زاد بھائیوں کے لئے مخاصمت کا سبب تھیں اس لئے ممکن ہے کہ اب زندگی سکھ چین سے بسر ہو جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شہادت

آپ کے خالہ زاد بھائیوں نے یہاں بھی آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اور ایک دن موقع پاکر آپ کو اور آپ کے تمام عزیزوں کو شہید کر دیا[1] اس اندوہ گین واقعہ کی تفصیل مولوی نور احمد نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں[2] کہ جب آپ ڈیرہ غازیخاں میں بمقام نگاہہ خیمہ زن ہو گئے تو آپ کے خالہ زاد بھائیوں نے اپنی قوم یعنی کھوکھر قبیلے کے بہت سے آدمیوں کو آپ سے بدظن کر دیا اور بالآخر سوا لاکھ کے لگ بھگ لوگ جمع کر کے آپ کے خلاف لشکر کشی کی۔ تاکہ آپ کو شہید کر دیں۔

جب کھوکھروں کا لشکر ڈیرہ غازیخاں پہنچا تو آپ کے سگے بھائی سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا دڈور میں مقیم تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو نگاہہ (سخی سرور) سے کوئی بارہ کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ خان ڈھوڈا یہاں خس کا چھپر ڈال کر رہا کرتے تھے۔ جناب الٰہی سے بک گائے جس کا نام سرھوں تھا، ان کے لئے آئی ہوئی تھی۔ وہ اس گائے کا دودھ پیا کرتے اور شب و روز عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ بکن نام کا ایک شخص اس گائے کی خدمت پر مامور تھا۔ جس وقت غنیم کا لشکر دڈور کے قریب پہنچا تو خان ڈھوڈا نماز میں مصروف تھے۔ فارغ ہوئے تو خادم نے اطلاع دی کہ یا مولیٰ! دشمن سر پر آگیا ہے۔ وہ یہ سن کر گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلے کے لئے نکلے۔ کوئی بہتر آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیئے۔ آخر جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو دشمنوں نے ان پر قابو پا لیا اور بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا۔ پھر ان کی گائے

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۰۳۔ ج دوم، ص ۲۴۸

[2] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۱۔ ۲۱۲

سرھوں کو قبضہ میں لیکر بکن سے پوچھا کہ سید احمد کہاں ہیں۔ تاکہ ان کا بھی کام تمام کر دیں۔ بکن نے جواب دیا کہ سیّد احمد سلطان ایسے ولی اللہ ہیں کہ تلوار کے ایک ہی وار سے تم سب کا ستیاناس کر دیں گے۔

آخر دشمنوں کا لشکر حضرت سخی سرور کی تلاش میں روانہ ہوا۔ جب نگاہہ پہنچا تو دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں اور آپ کا خادم خاص شیخ گاڑھا، لکی گھوڑی پر زین وغیرہ کس کر مستعد کھڑا ہے۔ آپ نماز سے فارغ ہو کر اسی گھوڑی پر سوار ہوئے اور مردانہ وار دشمنوں سے لڑنے لگے اور بالآخر شہید ہو گئے۔

مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا[1] میں لکھا ہے کہ حضرت سخی سرور کی شہادت صحیح اور مستند روایتوں کی رُو سے ۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء میں ہوئی۔ انھوں نے مندرجہ ذیل قطعہ درج کیا ہے جس کے آخری مصرع سے سالِ وفات برآمد ہوتا ہے:

سیّد سرور و سخی احمد | بود سلطان عالم و والی
جست سرور چو سال تاریخش | ھاتفش گفت سرور عالی (۵۷۷ھ)

مولوی نور احمد نے بھی اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں یہی قطعہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ تحریر کیا ہے[2]۔ نیز انھوں نے لکھا ہے[3] کہ حضرت سخی سرور کی وفات ۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء میں واقع ہوئی۔ یعنی

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۳۰۹ - ج دوم، ص ۲۴۸ - نیز دیکھیں آب کوثر، ص ۹۱ - چشمہ کوثر، ص ۱۸ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸ -

[2] قطعہ یہ ہے:

سیّد سرور و سخی احمد | بود سلطان عالم و والی
جست چشتی چو سال ترحیلش | ھاتفش گفت سرور عالی

(دیکھیں تحقیقات چشتی، ص ۲۰۰) - مفتی غلام سرور اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ اصل میں راقم الحروف کی تخلیق تھا لیکن مولوی نور احمد نے میرے نام کی جگہ اپنا نام داخل کر کے اسے اپنی کتاب تحقیقات چشتی میں درج کر دیا ہے۔ لہٰذا چار و ناچار میں نے اس قطعہ سے قطع نظر کر کے ایک اور قطعہ کہا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے ؎

بادشاہِ غزنویہ ختم الملوک خسر ملک کی وفات کے کوئی تین سال بعد اور شاہان غوریہ کی عملداری کے ابتدائی سال ہیں، جبکہ برصغیر پاک و ہند محض بے چراغ تھا اور کوئی حاکم یا بادشاہ مستقل الحکومت نہ تھا۔ تا آنکہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک نے تخت دہلی پر جلوس فرمایا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا۔

حضرت سخی سرور کی تاریخ وفات کے متعلق تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایچ۔اے روز[1] اور ایڈورڈ مکلیگن[2] نے ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء کو آپ کا سال وفات قرار دیا ہے۔ آر سی ٹیمپل نے آپ کے بارے میں جو روایتیں جمع کی ہیں، ان کی رُو سے بھی آپ نے ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء میں شہادت پائی[3]۔ ایم میکالف نے آپ کا سالِ وفات ۶۵۰ھ مطابق ۱۲۵۲ء تحریر کیا ہے[4]۔ ہمارے خیال میں مفتی غلام سرور کا درج کردہ سالِ وفات صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اسی پر کم و بیش تمام جدید محققین کا بھی اتفاق ہے[5]۔ ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے بھی اسی سال کو درست تسلیم کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے تو تاریخِ وفات بھی درج کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں[6] کہ حضرت سخی سرور نے ۲۲ رجب المرجب ۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء کو رحلت فرمائی۔

سیّد احمد سخی سرور دلی	شد ز دنیا سرور ملک جنان
قطب سرور ۵۷۷ھ، سرور سالک ۵۷۷ھ بگو	نیز سرور واکی دین وصل آن ۵۷۷ھ

(ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۹۰۳۔ ج دوم میں یہ عبارت مذکور نہیں ہے۔

۳ھ تحقیقات چشتی، ص ۲۰۰

[1] GLOSSARY, VOL I, P 567.

[2] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 132.

[3] LEGENDS OF THE PUNJAB, VOL III, P 301, 310.

[4] CALCATTA REVIEW, VOL LX (60), 1875, P 80.

[5] آب کوثر، ص ۱۹۱۔ چشمۂ کوثر، ص ۸۱۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۸۔ الفقر فخری، ص ۷۲۔

[6] سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۲۲

پانچواں باب

تعلیمات حضرت سخی سرور

حضرت سخی سرور سے متعلق جو معلومات اس کتاب میں فراہم کی گئی ہیں وہ زیادہ تر صوفیا کے عام تذکروں سے ماخوذ ہیں یا پھر ان گزنیٹیروں سے حاصل کی گئی ہیں جو حکومتِ برطانیہ اور بعد میں حکومت پاکستان نے مختلف اضلاع اور علاقوں کے لئے مرتب کرائے۔ کسی ماخذ سے اس امر کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ حضرت سخی سرور نے اپنی حینِ حیات میں کوئی کتاب تصنیف کی تھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کوئی کتاب لکھی ہو اور وہ دستبردِ زمانہ سے تلف ہو گئی ہو، لیکن جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن با ایں ہمہ آپ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے عملاً جو کچھ کیا وہ آپ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے۔

آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بڑے فعّال اور سرگرم بزرگ تھے۔ اور اسی فعالیت اور سرگرمی کا سبب تھا کہ جم کر کسی ایک مقام پر نہیں بیٹھے۔ بغداد اور چشت تو خیر آپ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے لیکن پاک و ہند میں بھی آپ مختلف شہروں اور علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ چنانچہ اس ضمن میں شاہکوٹ، ملتان، لاہور، دھونکل، سوہدرہ، ایمن آباد اور ڈیرہ غازی خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی یہ سیاحت محض ایک جہاں گرد یا سیاح

کی نہ تھی بلکہ آپ جہاں کہیں جاتے لوگوں کو حقیقت اور سچائی کے راستے پر گامزن ہونے کی تلقین فرماتے۔ گو ہمارے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں جس سے صاف طور پر یہ پتا چل سکے کہ آپ کی تعلیمات کیا ہیں اور تبلیغات سے آپ نے کیا کچھ کام لیا۔ لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ آپ کا طریقِ کار عام صوفیا کے طریقِ کار سے ملتا جلتا ہے۔ آپ بلاشبہ ایک بڑے صوفی تھے اور آپ نے وہی کچھ کیا جو آپ سے پہلے اور بعد صوفیائے عظام کرتے رہے۔

شیخ اکرام مغربی پنجاب میں اشاعتِ اسلام کے ذیل میں لکھتے ہیں[1] کہ بزرگانِ کرام کے حالات بیشتر اولیا کے تذکروں اور مشائخ کے ملفوظات سے معلوم ہوتے ہیں۔ پاک و ہند کی مذہبی تاریخ میں یہ کتابیں بڑی کارآمد ہیں، اور اگر عقیدتمند مرید انھیں ترتیب نہ دے جاتے تو مذہبی زندگی کے کئی باب کورے رہتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کتابوں میں زور ان باتوں پر دیا گیا ہے جن کی قدر و قیمت زمانے کے ہاتھوں کم ہو گئی ہے۔ کرامات اور خارق العادات واقعات کے تو ان تذکروں میں طومار بندھے ہوئے ہیں لیکن بزرگوں کے صحیح تبلیغی کارناموں اور ان کی خالص بشری خوبیوں اور اخلاق و عادات سے بڑی بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تفتیش حالات کے لئے کوئی اور ماخذ نہ ہوتا تو معترض بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ چونکہ صوفیائے کرام کے اپنے تذکروں میں اشاعتِ اسلام کا خاص ذکر نہیں ہے اس لئے دَورِ حاضر کے مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ برِ صغیر پاک و ہند میں اسلام بادشاہوں کی تلواروں سے نہیں بلکہ اہل اللہ کے فیوض و برکات سے عام ہوا ہے، درخورِ اعتنا نہیں۔

لیکن خوش قسمتی سے تحقیق واقعات کا ایک اور اہم ماخذ بھی ہے۔ وقتاً فوقتاً مختلف ضلعوں اور علاقوں کی جو سرکاری دستاویزات یعنی گزیٹئر اور مردم شماری کی رپورٹیں وغیرہ تیار ہوتی رہی ہیں۔ ان میں مقامی باشندوں کی مذہبی سرگزشت کا بھی ذکر آتا ہے۔ بعض رپورٹیں مثلاً صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان اور صوبہ سندھ کے اضلاع کی تو اس بارے میں بڑی مایوس کن ہیں، اور ان

---

[1] آبِ کوثر، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔

میں سطحی معلومات کو دوسری رپورٹوں اور عام مروجہ کتب سے نقل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں یہ رپورٹیں قابل اور اہلِ علم افسروں کے قلم سے لکھی گئی ہیں وہاں مقامی معلومات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جس سے علاقے کی مذہبی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مغربی پنجاب اس معاملے میں بڑا خوش قسمت رہا ہے اور ملتان، ساہیوال (منٹگمری) اور ریاست بہاولپور کی رپورٹوں سے مذہبی مورخ کو بیش بہا مدد ملتی ہے۔

ضلع ملتان کا گزیٹیئر، سر ایڈورڈ مکلیگن نے مرتب کیا تھا، جو ایک زمانے میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نائب صدر تھے۔ اور اپنی تاریخی تصانیف کی وجہ سے اہلِ علم میں ممتاز ہیں۔ اپنی رپورٹ میں سر ایڈورڈ نے علاقے کی مذہبی تاریخ پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے جس سے حضرت سخی سرور کی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ سر ایڈورڈ ممالک اسلامی میں تاتاریوں کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1] کہ ایک لحاظ سے خراسان اور مغربی ایران کی تباہی سے پاک و ہند کے اس حصے کو جسے مغربی پنجاب کہتے ہیں بڑا فائدہ پہنچا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے علما و صلحا کی ایک کثیر تعداد یہاں آ گئی، جن میں سے بعض تو دارالسلطنت دہلی کی طرف چلے گئے لیکن بہت سے ملتان کے علاقے میں ہی بس گئے۔ غوری افغانوں کی ابتدائی ہلچل کے زمانے میں ہی گردیزی سیدوں کا ایک خاندان اس ضلع میں آباد ہوا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ضلع ڈیرہ غازی خاں کے قریب کوٹ کروڑ میں خوارزم سے آ کر قریشیوں کا ایک خاندان آباد ہوا جس میں آگے چل کر شیخ بہاالدین زکریا ملتانی پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تمام اسلامی دنیا کی سیر و سیاحت کے بعد ملتان کو اپنا مستقر بنایا۔ اس زمانے میں سبزوار سے پیر شمس تبریز اور کاشان سے قاضی قطب الدین ملتان تشریف لائے اور پاکپتن میں بابا فرید گنج شکر اور دہلی میں براستہ ملتان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رونق افروز ہوئے۔ اچہ میں سید جلال بخاری جو ملتان، مظفر گڑھ اور بہاولپور کے کئی خانوادوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں، اسی زمانے میں آئے اور انہی ایام کے لگ بھگ سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور نے

---

[1] آبِ کوثر، ص ۳۲۴، بحوالہ ملتان گزیٹیئر۔

فروغ پایا جن کے والد حضرت سید زین العابدین بغداد[1] سے آکر ضلع ملتان کے قریب شاہکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔

ان مقدس ہستیوں اور ان کے بے شمار رفقائے کار نے اس علاقے کے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور یہ ان بزرگوں کی تلقین اور ان کے اثر کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی بادشاہ کی تیغ آزمائی کا، کہ اب مغربی پنجاب کے اکثر باشندے مسلمان ہیں۔ ابتدا میں مسلمانوں نے اشاعتِ اسلام سے جو سرد مہری برتی تھی وہ اس مذہبی جوش کی بنا پر جو منگولوں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش میں پیدا ہوا، جاتی رہی۔ اب ایک بادشاہ کے مقبرے میں ایک مذہبی بزرگ (حضرت شیخ رکن العالم) کو جگہ ملی۔ اور اس زمانے سے ملتان کی ان مقدس ہستیوں اور مقدس مقامات کا آغاز ہوا۔ جن کی بدولت ملتان کو تمام اسلامی دنیا میں ایک غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔

سر ایڈورڈ مکلیگن نے مختلف قبیلوں کا ذکر کرتے ہوئے بعض مشہور قبائل کے قبول اسلام کی تاریخ بھی لکھی ہے[2] مثلاً راجپوتوں میں سیال ایک مشہور قبیلہ ہے جو اضلاع ملتان، ساہیوال (منٹگمری)، جھنگ (سیالاں) میں کثرت سے آباد ہے۔ یہ قبیلہ حضرت سخی سرور کی تبلیغی سرگرمیوں کے بعد ذرا آگے چل کر، بابا فرید گنج شکر کے ہاتھ پہ مسلمان ہوا تھا۔ نون، حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پہ ایمان لائے تھے۔ اور جوئیہ راجپوتوں کو حضرت شیخ رکن عالم نے مسلمان کیا۔

سر ایڈورڈ مکلیگن نے مختلف قبائل کی نسبت جو تفصیلات دی ہیں ان پہ مسٹر بورن اور مسٹر ڈیس نے جنھوں نے ساہیوال (منٹگمری) کا گزیٹیر مرتب کیا ہے، بعض باتیں اضافہ

---

[1] سر ایڈورڈ مکلیگن نے یہاں بخارا لکھا ہے جو درست نہیں۔

[2] آبِ کوثر، ص ۳۲۵، بحوالہ ملتان گزیٹیر۔

[3] آبِ کوثر، ص ۳۲۶،۳۲۵، بحوالہ ساہیوال (منٹگمری) گزیٹیر۔

کی ہیں۔ وہ کھرل راجپوتوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کا مورثِ اعلیٰ ہستناپور کا راجا کرن تھا۔ اس کے ایک جانشین بھوپا نے ہستناپور چھوڑ کر اُچہ میں رہائش اختیار کی۔ اور یہاں بھوپا، اور اس کے بیٹے کھرل نے حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اُچہ سے یہ قبیلہ بڑھتے بڑھتے دریائے راوی کے دونوں طرف پھیل گیا۔ اسی طرح وٹو قبیلے کو، جو ستلج کے دونوں بازوؤں پر ساٹھ میل تک اور علاقہ گوگیرہ میں آباد ہے، جو حضرت سخی سرور کی تعلیمی و تبلیغی کارروائیوں کے بعد بابا فرید گنج شکر نے مسلمان کیا۔ سیالوں کی نسبت اس گزیٹیر میں مرقوم ہے[1] کہ وہ ۱۲۵۸ء کے لگ بھگ بابا فرید کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

بزرگانِ کبار، جن میں حضرت سخی سرور بھی خاصی شہرت اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، کی مذکورہ بالا کاوشوں کے علاوہ ساہیوال (منٹگمری) کے اس گزیٹیر کے ایک اندراج سے اسلام کی ان جمہوری خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے، جن سے اشاعتِ اسلام کا کام بڑی حد تک آسان ہوگیا۔ راجپوت اقوام کے ضمن میں اس گزیٹیر میں لکھا ہے[1] کہ مسلّی اگرچہ اب کی مردم شماری سے راجپوت اقوام میں شمار نہیں ہوتے، لیکن ان کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو خاکروب (بھنگی) تھے، جو مسلمان ہو کر مسلّی بن گئے۔ ان کی تعداد اس ضلع میں چھیالیس ہزار سے زیادہ ہے۔ دیہات میں تو وہ خاکروبی اور کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں لیکن شہروں میں مختلف اقسام کے کئی پیشے جنہیں ہندو بھنگی اختیار نہیں کر سکتے، اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جولاہوں، باورچیوں، بہشتیوں اور رنگسازوں کا بھی کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بھنگی اور اس طرح کے دوسرے پسماندہ قبیلے جن پر ہندو ہونے کی صورت میں ذلیل ترین پیشوں کے علاوہ باقی سب اقتصادی دروازے بند تھے، مسلمان ہو کر تمدنی لحاظ سے اس طرح ترقی کر سکتے تھے، تو پھر ان کے لئے مسلمان ہونا کس قدر آسان اور دنیوی نقطۂ نظر سے بھی کس قدر مفید ہوگا۔

اشاعتِ اسلام کے خاص اسباب

اس انقلاب کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو دہلی میں حکومتِ اسلامی کا قیام اور اس کی توسیع

---

[1] آبِ کوثر، ص ۳۲۶، بحوالہ ساہیوال گزیٹیر

تھا جس سے مسلمان صوفیوں اور مبلغوں کو پاک و ہند کے مختلف حصوں میں بلا کھٹکے جانے کا موقعہ ملا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وجہ تاتاریوں کا حملہ تھا، جس نے اسلامی دنیا کا نظامِ زندگی درہم برہم کر دیا اور کثیر تعداد میں علماء و مشائخ اسلامی ممالک سے جان بچا کر پاک و ہند میں پناہ گزین ہوئے۔ جیسا کہ سر ایڈورڈ مکلیگن نے ضلع ملتان کے سرکاری گزیٹیئر میں بتایا ہے، اس زمانے کے تمام مشائخ کبار، جن میں حضرت سخی سرور کے والد ماجد، حضرت زین العابدین بھی تھے، ان علاقوں سے آئے، جہاں تاتاریوں نے ان کے لئے زندگی دوبھر کر دی تھی۔ اور اگرچہ منگولوں کے حملے سے اسلامی ممالک کو بے انتہا نقصان پہنچا لیکن خطۂ پاک و ہند کو فائدہ رہا۔ اور ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلام کو بڑی رونق اور ترقی ہوئی۔

مشائخ کبار کی آمد کے علاوہ ہم ویسے بھی اس زمانے میں ایک نئی مذہبی زندگی کے آثار دیکھتے ہیں۔ اسلامی تاریخوں میں مغل سفاکیوں اور مظالم کا حال پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سمجھتے تھے گویا یاجوج ماجوج آ گئے۔ اور ہمیں اپنی مقدس ترین چیزوں کو ان سے محفوظ کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسلمان، جہاں کہیں وہ تھا، خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ اور اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لئے ایسی کوششیں ہوئیں، جن کی مثال پانچ سو سال پہلے قرونِ اولیٰ میں ہی نظر آتی ہے۔ یہ مساعی جمیلہ درگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئیں اور نہ صرف تاتاری حلقہ بگوش اسلام ہوئے، بلکہ مذہبی جوش کا سیلِ گراں اسلام کو ان علاقوں میں لے گیا جہاں ابھی تک اس مذہب کا نام بھی نہ پہنچا تھا۔

حضرت سخی سرور اور دیگر صوفیائے کرام کا طریق

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام نے پھیلایا۔ ابتدائی عہد کے بعض صوفیا اور حضرت سخی سرور کے معاصر اولیا کا تھوڑا سا ذکر صوفیائے معاصر کے باب میں کیا گیا ہے۔ ان کا اور ان کے بعد آنے والے تمام صوفیا اور اولیا کا مطمحِ نظر اور طریقِ کار ایک ہی تھا۔ اگر کہیں کچھ فرق نظر آتا ہے تو اس کی حیثیت فروعی

ہے، بنیادی اور اساسی نہیں۔ ان صوفیائے عظام کا نقطۂ نظر اور اسلوب کار دورِ حاضر کے مشنریوں اور مبلغوں سے بالکل مختلف تھا۔[1] انھوں نے اپنے آپ کو فقط غیر مسلموں میں اشاعتِ اسلام کے لئے وقف نہیں کر رکھا تھا بلکہ تبدیل مذہب تو سوائے بعض اسمٰعیلیوں اور سہروردیوں کے شاید ان کا مقصد اولین ہی نہیں تھا۔ ان کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے تھے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب۔ ان کا کام ہر ایک میں بلا کسی تفریق کے ارشاد و ہدایت تھا۔ ایک ہندو کے قبولِ اسلام سے انھیں جتنی خوشی ہوتی تھی، اس سے کہیں زیادہ ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی تھی۔ صوفیا کے اس جامع نقطۂ نظر کو سلسلۃ الذہب کے مصنف نے خوب واضح کیا ہے۔ وہ حضرت سخی سرور کے ہم عصر اور پیر بھائی اور سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ شیخ بہاالدین زکریا ملتانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2] کہ لوگوں کی ارشاد و ہدایت میں کفر سے ایمان کی طرف گناہ سے عبادت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

حضرت سخی سرور اور دوسرے مشائخ کبار کے سامنے یہی مطمح نظر تھا، جو سلسلۃ الذہب کے بیان کے مطابق شیخ بہاالدین زکریا کا تھا۔ وہ ہر ایک کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلندتر روحانی زندگی کا پیغام دیتے۔ اور اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار اسلام کی طرف، اور عام مسلمان ایک پاک بے عیب زندگی کی جانب مائل ہوتے گئے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان صوفیہ کا، جن میں حضرت سخی سرور بھی شامل ہیں، واحد یا اہم ترین مقصد اسلام کی اشاعت نہ تھا، لیکن انھیں اس کام میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ پاک و ہند کے خاص حالات تھے۔ ہندو مذہب ایک مشنری مذہب نہیں۔ آریہ سماج کے آغاز سے پہلے ہندوؤں کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر قوموں میں اپنا مذہب پھیلائیں۔ بلکہ سچے مذہب کی نسبت تو اُن کا نقطۂ نظر تھا کہ یہ صرف خواص کا حق ہے۔

---

[1] آبِ کوثر، ص ۲۱۳

[2] آبِ کوثر، ص ۲۱۳، بحوالہ اخبار الاخیار، ص ۲۷۔

ہر کہ ومہ اس کا مستحق نہیں۔ اور جو شخص اس سے محروم رہتا ہے اس میں اس کی تباہی ہے، مذہب کا کوئی نقصان نہیں۔ یہی اسلوب خیال تھا جس کی بنا پر منو نے شودروں اور نیچ ذات کے لوگوں کو اعلیٰ مذہبی واقفیت حاصل کرنے اور مذہبی عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی شودر مقدس وید کے منتر سُن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے[1]۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کے ہوتے ہوئے اشاعتِ اسلام میں کامیابی حاصل کرنا، بالخصوص ان لوگوں میں دین پھیلانا جو کسی بھی دین و مذہب کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے، چنداں دشوار نہیں۔

اگر سجی سرور اور ہمارے دوسرے صوفیائے کرام کا مطمحِ نظر عہدِ حاضر کے مبلّغوں سے مختلف تھا تو ان کا طریقِ کار بھی اس زمانے کے عیسائی مشنریوں کی عین ضد تھا۔ انھوں نے کبھی یہ نہ کیا کہ دوسرے مذہبوں اور ان کے بانیوں کی بدگوئی کر کے اپنے مذہب کی فضیلت ثابت کریں۔ دوسرے مذاہب کی طرف ان کا طرزِ عمل انتہائی رواداری اور صلح پسندی کا تھا۔ ہاں ان مذہبوں میں سے جو شخص ان کی اپنی کرامات یا پاک زندگی دیکھ کر ان کے اور ان کے مذہب کے قائل ہو جاتے، انھیں اپنے دامن کے نیچے جگہ دینے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتے۔

شیخ کلیم اللہ کے مکتوبات میں صوفی طریق کار کی ایک اور جگہ وضاحت ہوتی ہے۔ وہ اپنے خلیفۂ اعظم شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو خطاب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں[2]۔ کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ صلح صفائی رکھنی چاہیے۔ ان دونوں میں سے جو کوئی آپ کا معتقد ہو ذکر و فکر اور مراقبہ وغیرہ سے اس کو آگاہ کیا جائے کیونکہ ذکر بجائے خود ایسی خاصیت رکھتا

---

[1] آب کوثر، ص ۲۱۵

[2] "صلح با ہندو و مسلمان سازند۔ ہر کہ ازین دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشند۔ ذکر و فکر و مراقبہ و تعلیم او را بگویند کہ ذکر بہ خاصیت خود او را بہ ربقۂ اسلام خواہد کشید۔ و یا غیر معتقد، اگرچہ سیّد زادہ باشد تعلیم نہ باید کرد (مکتوبات شیخ کلیم اللہ، ص ۸۶۔ نیز دیکھیں آب کوثر، ص ۲۱۶)

ہے کہ ذاکر کو دائرہ اسلام میں کھینچ لائے گا اور جو شخص آپ کا عقیدت مند نہ ہو، خواہ وہ سید زادہ ہی ہو، اسے ذکر وفکر کی تعلیم نہیں دینی چاہیئے۔

شیخ کلیم اللہ اور اسی طرح حضرت سخی سرور اور دوسرے صوفیاء کا طریق اگرچہ صلح کل تھا۔ لیکن وہ اسلام کی توسیع سے بے پروا بھی نہ تھے۔ چنانچہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں[1] کہ بھیا دیا رام اور دوسرے ہندو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں لیکن وہ قبول اسلام کو اپنے قبیلے کے لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ برادرِ من! کوئی ایسا انتظام کرو کہ آہستہ آہستہ یہ امر جلیل اخفاء سے اظہار میں آجائے۔

حضرت سخی سرور اور دوسرے تمام صوفیاء کے صلح کل طریقوں اور ہندوؤں کے مذہب کے متعلق خاص نقطۂ نظر کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیاء کی اشاعت اسلام کی کوششوں کی کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی۔ بلکہ ہندوؤں نے ان کو عزت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ آج بھی پاک و ہند کے بہت سے ہندو حضرت سخی سرور کے معتقد ہیں۔ علاوہ ازیں جن صوفیا نے اشاعتِ اسلام میں غیر معمولی شہرت پائی۔ ہندوؤں نے ان کو بھی نگہ احترام سے دیکھا۔ مثال کے طور پر حضرت سخی سرور کے ہم عصر ولی الہند، حضرت خواجہ اجمیری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جو مبلغین اسلام میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے، اور قدیم تذکرے گواہ ہیں کہ اجمیر میں ان کے آنے سے روحانی طور پر اسلام کا بول بالا ہوا۔ ان کی نسبت ہندوؤں کا جو نقطۂ نظر تھا اس کی بابت سفینۃ الاولیا میں دارا شکوہ کا بیان ملاحظہ ہو:

"آپ کی برکت سے بہت سے کفار مسلمان ہوئے اور جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا، وہ نذر و فتوح آپ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ آج بھی جو کفار آپ کے مزار مبارک کے مضافات میں رہائش پذیر ہیں۔ روضہ کی زیارت کے لئے آتے اور روضہ کے مجاوروں کو

---

[1] "و دیگر مرقوم بود۔ بھیا دیارام و ہندو ہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام درآمدہ اند۔ اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند۔ برادرِ من! اہتمام نمائید کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بہ اظہار انجامد (مکتوباتِ شیخ کلیم اللہ، ص ۳۰، آبِ کوثر، ص ۲۱۷)

بیش قیمت نذرانے دیتے ہیں۔[1]

ہندوؤں کے ایک رہنما رائے بہادر ہربلاس شاردا، بھی جو شاردا ایکٹ کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں، اجمیر کے متعلق اپنی انگریزی کتاب میں حضرت خواجہ بزرگ کو اس طرح خراجِ عقیدت ادا کرتے ہیں"۔ (ترجمہ)

"خواجہ معین الدین چشتی نے پرہیزگاروں کی زندگی گزاری ...... انھوں نے زیادتی کرنے کی کبھی تلقین نہیں کی۔ اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطۂ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔[2]

پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کے ضمن میں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام اس خطے کے ان علاقوں میں سرعت سے پھیلا، جہاں ابھی ہندو مذہب نے بدھ مت کو اچھی طرح دبا نہ لیا تھا۔ اور چھوت چھات، اونچ نیچ اور ذات پات کا معاشرتی نظام عوام کی زندگی پر پوری طرح حاوی نہ ہوا تھا۔ جب مسلمان سندھ میں آئے تو رعایا کا ایک بڑا حصہ بدھ مذہب کا پیرو تھا اور وہ لوگ برہمن راجا سے سخت آزردہ تھے۔ اسی طرح بنگال کی نسبت سپرنٹنڈنٹ محکمہ مردم شماری لکھتا ہے (۱۹۱۱ء)[3]: کہ اسلام کی آمد کے وقت اس علاقے میں ابھی ہندو مذہب نے دوبارہ فروغ حاصل نہ کیا تھا، اور بدھ مذہب کی ایک بگڑی ہوئی صورت یہاں رائج تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کے لئے پاؤں جمانا آسان نہ تھا۔ کیونکہ خواہ روحانی طور پر تبدیلیِ مذہب کی نسبت ہندوؤں کا جو بھی نقطۂ نظر ہو لیکن ان کا معاشرتی نظام بڑا سخت تھا اور ایک فرد کے لئے مذہب چھوڑ کر برادری کی مخالفت جھیلنا بڑا تکلیف دہ تھا۔

---

[1] جمعی کثیری از کفار بہ برکت قدوم ایشاں مسلمان شدند و جماعہ کہ مسلمان نشدہ بودہ، فتوح و نیاز بخدمت ایشاں می فرستادند و ہنوز کفاری کہ در آن نواحی اند بزیارت ایشاں می آیند و مبلغ ہا بہ مجاورانِ روضہ منورہ میگزرانند (سفینۃ الاولیا، ص ۹۳)

[2] اجمیر از شاردا، ص ۸۵۔ نیز دیکھیں، آبِ کوثر، ص ۲۱۸)

[3] آبِ کوثر، ص ۲۱۸ بحوالہ رپورٹ مردم شماری۔

سیدؒ گیسو دراز کے ملفوظات اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ اسلامی مبلغین کی راہ میں بڑی رکاوٹ روحانی نہ تھی بلکہ ذات پات کا نظام تھا۔ اور جن علاقوں میں یہ نظام ابھی مستحکم نہیں ہوا تھا (یعنی سندھ، مغربی پنجاب اور بنگال وغیرہ) وہاں اشاعتِ اسلام کا کام آسانی سے سرانجام پا گیا۔[1]

اشاعتِ اسلام کے علاوہ بزرگان کرام نے جن میں حضرت سخی سرور بھی بلند درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، انھیں بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آج لوگ ان کے کام کا اندازہ ان کے جانشینوں اور مریدوں کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ جنھوں نے ان کی یادگاروں کو تجارت کا سرمایہ بنا رکھا ہے، یا مزاروں پہ ان زائرین کا ہجوم دیکھ کر کرتے ہیں، جنکی ایک ایک حرکت سے توہم پرستی اور جہالت ٹپکتی ہے اور جن کے نزدیک شخصی صفائی تو شاید ایک عیب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بزرگان کرام کا اندازہ ایسے لوگوں سے کرنا بے انصافی ہے۔ اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم ان بزرگوں کے صحیح اور مستند حالات پڑھیں اور ان کے اقوال و افعال پر غور کریں۔

آج ہمارے لئے اس پاکیزہ فضا میں پہنچنا جو حضرت سخی سرور، حضرت خواجہ اجمیری، شیخ کبیر بابا فرید، سلطان المشائخ، حضرت چراغ دہلی، نور قطب العالم، خواجہ باقی باللہ بزرگ کے گرد و پیش موجود تھی، ناممکن ہے۔ لیکن اگر آج بھی ہم جاہل کرامت فروشوں کے قصے، کہانیوں کو نظر انداز کردیں اور مستند اور صحیح معاصرانہ ملفوظات اور تذکروں کو دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ کیسی کیسی پاک ہستیاں تھیں اور ان کی تعلیمات و تبلیغات سے مسلمانو کو کیا کیا فیض پہنچ رہا تھا۔ آج بھی اگر فوائد الفواد، سیر الاولیاء، زبدۃ المقامات اور اسی طرح کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں اور ان کا موازنہ کلامی تصانیف سے ہی نہیں، مسائل شریعت کی کتب سے بھی کریں تو پھر صاف نظر آجاتا ہے کہ اسلام حقیقی کہاں ہے اور تصوف کے انحطاط کے ساتھ قوم میں ایک اخلاقی اور روحانی زوال کیوں آگیا۔[2]

---

[1] آبِ کوثر، ص ۲۱۸، ۲۱۹ بحوالہ ملفوظات سید گیسو دراز
[2] یہ تفصیلات آبِ کوثر، ص ۲۱۱-۲۲۰ سے ماخوذ ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش کے بعد پنجاب میں رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا کام سید احمد سلطان المعروف حضرت سخی سرور نے بڑے شد و مد سے کیا۔ آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد ریاضت و عبادت اور تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کے لئے اپنا پہلا مرکز سوہدرہ کو قرار دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ خلقت کا ہجوم ہر وقت آپ کے گرد جمع رہتا، جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، دلی مراد پاتا۔ اسی بنا پر آپ کا لقب سخی سرور مشہور ہو گیا۔ سوہدرہ کے بعد آپ دھونکل پہنچے۔ یہاں بھی ہدایتِ خلق میں مشغول رہے۔ یہاں سے اٹھے تو اپنے وطن شاہ کوٹ گئے اور پھر ڈیرہ غازی خاں میں اقامت اختیار کی۔ غرض آپ جہاں کہیں بھی گئے، فریضۂ تبلیغ سے غافل نہ ہوئے۔ پورے انہماک اور کامل سرگرمی سے یہ فرض ادا کرتے رہے۔ آخر آپ کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے اور انھوں نے موقع پا کر آپ کو شہید کر دیا۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت سخی سرور بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے معتقد نہ صرف مسلمان تھے بلکہ دوآبہ کے اکثر ہندو اور سکھ بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔ آپ کے ہندو معتقد سلطانی کہلاتے ہیں، جن کی بابت مریدینِ سخی سرور کے باب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے آپ کے سلطانی معتقد متحدہ پنجاب کے گوشے گوشے سے ڈیرہ غازی خاں کا رُخ کرتے تھے، آپ کے مزار کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔ آج بھی بہت سے سلطانی عقیدت مند ہر سال وسط فروری میں قافلے بنا کر اپنے ٹھکانوں سے نکلتے ہیں اور ڈیرہ غازی خاں میں جا کر آپ کے مزار کی زیارت کرتے ہیں۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں ملتان کے ہندو گورنر، دیوان ساون مل[۱] نے تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر سلطانیوں کو حضرت سخی سرور کے مزار کی زیارت سے باز رکھنا چاہا، لیکن اس مقصد میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر چل کر اس نے ہر ایک یاتری سے سوا روپیہ ٹیکس وصول کیا مگر یہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔ تقسیم ہند تک زیارت کا یہ سلسلہ بڑے جوش و خروش سے جاری رہا۔ گو تقسیم کے بعد اس میں خاصی کمی ہو گئی لیکن

---

[۱] الفقر فخری، ص ۷۷، ۷۸۔

سالانہ عرس کے موقع پر زائرین کا سیلِ بے پناہ اب بھی نظر آتا ہے۔ جس کا ذکر اپنے مقام پر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ اس باب کے شروع میں ذکر آچکا ہے، حضرت سخی سرور کی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا صحیح اندازہ پاک و ہند کے مختلف علاقوں کے سرکاری گزیٹر سے ہوتا ہے۔ بعض رپورٹوں کے اقتباسات مریدین سخی سرور کے باب میں درج کیے گئے ہیں۔ جالندھر اور لدھیانہ کے گزیٹر میں مرقوم ہے کہ یہاں کے اکثر ہندو حضرت سخی سرور کے معتقد ہیں۔ اسی طرح ہوشیارپور کی رپورٹ میں بھی ایک اندراج ہے۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ "اس ضلع کا مشہور مذہبی فرقہ سلطانیہ ہے، جو حضرت سخی سرور کا پیرو ہے۔ یہ فرقہ زیادہ تر پنجاب میں نظر آتا ہے۔ سلطانی ہر قوم اور مذہب میں دکھائی دیتے ہیں اور سرور نگاہی[۱] کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کا نام سید احمد سلطان تھا اور آج سے کوئی چھ سو سال[۲] قبل اس خطے میں تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ آپ کا مزار ڈیرہ غازی خاں میں واقع ہے۔ زائرین کی مختلف جماعتیں ہر سال عرس کے موقع پر مزار اقدس کی زیارت کو جاتی ہیں۔ ان جماعتوں کا پیشوا مسلمان اور بھرائی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ حضرت سخی سرور کا اثر زیادہ تر پنجاب کے گوجر قبیلے کے لوگوں پر یا کم پڑھے لکھے طبقوں کے افراد پر ہے۔ جہاں کہیں آپ کے معتقدین کی تعداد زیادہ ہے وہاں ایک چھوٹی سی خانقاہ بھی موجود ہے جس کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار اور درمیان میں گنبد ہوتا ہے۔ اس کی شکل و صورت ہندوؤں کی سمادھ سے ملتی جلتی ہے فرق صرف مینار کا ہے۔ سلطانیوں کی رسموں میں سے ایک یہ ہے[۳] کہ وہ جھٹکا نہیں کھاتے بلکہ

---

[۱] مراد حضرت سخی سرور جنھوں نے عمر کے آخری ایام میں نگاہہ واقع ڈیرہ غازیخان کو اپنی تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔ یہ جگہ آجکل آپ کے لقب سخی سرور کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کا مزار بھی یہیں واقع ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے کتاب ہذا، ص ۱۸۷۔

[۲] یہ مدت ہوشیارپور کی سرکاری رپورٹ کے مرتب ہونے سے قبل کی ہے۔ آج تو حضرت سخی سرور کو گزرے کوئی آٹھ سو سال ہو چکے ہیں۔

[۳] سلطانیوں کی رسومات کا تفصیلی ذکر مریدین حضرت سخی سرور کے باب میں کیا گیا ہے

حلال جانور کا گوشت کھاتے ہیں۔ ہر مذہب اور قوم کے لوگ اپنا مذہب یا قومیت تبدیل کئے بغیر سلطانی بن سکتے ہیں۔ حضرت سخی سرور کی پرستش عورتوں میں عام ہے۔ چنانچہ اس ضلع کی کھترانیاں آپ کی عقیدت مند ہیں۔ بعض برہمن بھی آپ سے گہری ارادت رکھتے ہیں۔ آپ کی پرستش یا عقیدت کا آسان اور عام طریقہ یہ ہے کہ لوگ بستر کی بجائے زمین پر سوتے ہیں۔ حضرت سخی سرور سے ہندوؤں کی عقیدت اور ارادت کا ایک دلچسپ اور معنی خیز پہلو یہ ہے کہ ان کے گھروں میں اسلامی طرزِ عبادت کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔[1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: NORTH INDIAN NOTES AND QUERIES, VOL. - IV NO 4, JULY, 1894, NOTE, 146, P 59.

نیز دیکھیں: COLDSTREAM IN SETTLEMENT REPORT, P 32.

چھٹا باب

حضرت سخی سرور کے مریدین

قبل اس کے کہ ہم حضرت سخی سرور کے مریدوں کی بابت کچھ تحریر کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ ایک بزرگ کی خدمت میں کس قسم کے لوگ حاضر ہوتے ہیں اور اس کی صحبت سے کیسا فیض اٹھاتے ہیں؟۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ حضرت سخی سرور کی خدمت میں عموماً کس طرح کے لوگ حاضر ہوتے رہے اور ان کی صحبت سے کیسا فیض حاصل کرتے رہے۔ اس صورت میں ان کے مریدوں کے متعلق وثوق سے کچھ کہا جا سکے گا۔

خلیق احمد نظامی اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں لکھتے ہیں[1] کہ مشائخ کرام کی خدمت میں مختلف قسم کے لوگ حاضر ہوتے تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیتیں، ضروریات اور مقاصد مختلف ہوتے تھے۔ چنانچہ مشائخ کو ان کی اصلاح و تربیت کے لئے مختلف طریقے اور تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ آنے والوں میں بالعموم چار قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ خلفاء

۲۔ خاص مریدین: یعنی وہ لوگ جن کو خلافت سے تو نہیں نوازا جاتا تھا لیکن ان کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اور وہ اکثر و بیشتر شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

۳۔ عام مریدین: جو بیعت کرنے کے بعد عموماً شیخ سے جدا ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ۲۷۳

۴۔ عوام: یعنی وہ لوگ جو مختلف دینی اور دنیوی مقاصد کے لئے شیخ کے پاس آتے تھے۔

خلفائے حضرت سخی سرور

جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے کسی تذکرہ یا کتاب سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت سخی سرور نے کسی شخص کی جانب اس طرح توجہ کی ہو جس طرح ایک مرشد اپنے خلیفہ کی طرف کرتا ہے۔ آپ کے سوانح حیات منتشر طور پر جہاں کہیں مذکور ہوئے ہیں، ان سے قطعاً یہ بات پایۂ اثبات کو نہیں پہنچتی کہ آپ نے اپنے عقیدت مندوں یا مریدوں میں سے کسی کو اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سے یقیناً آپ کے روحانی سلسلوں کو فروغ پہنچتا۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آپ سے کوئی سلسلہ نہیں پھیلا اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ آپ کے خلفا نہیں تھے۔

بعض کتابوں[1] کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور کے حلقۂ احباب میں چار بزرگ بھی تھے، جن کے مزارات آپ کے روضۂ مبارک کے قریب ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ ان بزرگوں کے نام نور۔ اسحاق۔ علی اور عثمان بتائے جاتے ہیں۔ اس بارے میں تمام ماخذ خاموش ہیں کہ مذکورہ بزرگ آپ کے خلیفہ تھے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان بزرگوں کی جانب خصوصی توجہ فرمائی ہو اور انھیں اپنا خلیفہ بنا لیا ہو۔ لیکن حالات نے انھیں اتنا موقع نہ دیا کہ وہ آپ کے ارشادات پر عمل کر کے لوگوں میں آپ کے روحانی سلسلوں کو عام کرتے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت سخی سرور کی شہادت سے پہلے دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے[2]

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P134. ‹ GLOSSARY, VOL 1, P 567-68.

[2] ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے تحریر کیا ہے کہ میاں نور، میاں محمد اسحاق، میاں عثمان اور میاں

ملک غوث، خلیفہ دربار سخی سرور، نے لکھا ہے[1] کہ متذکرہ بالا بزرگ حضرت سخی سرور کے چار یار تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یار ہونے کی وجہ سے وہ آپ کے خلیفہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اس بات سے تو اس خیال کو زیادہ تقویت پہنچتی ہے کہ یہ چاروں بزرگ آپکے خلفا تھے۔ کیونکہ یہ سعادت صرف خلفا ہی کو حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے مشائخ کی صحبتوں میں یاروں کی طرح اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ چاروں بزرگ آپ کے خلفا ہوں اور آپ نے کسی خاص مقصد کے لئے انھیں مامور فرمایا ہو۔ ان کی تربیت و اصلاح میں آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات صرف کئے ہوں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے پاس ایسی معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں جس کی بنا پر ہم اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہہ سکیں۔ کافی تلاش اور جستجو کے بعد ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ مذکورہ بزرگ کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کب اور کن حالات میں حضرت سخی سرور کی خدمت میں حاضر ہوئے؟ اور حضرت سخی سرور ان سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔

کسی کتاب یا تذکرہ میں ان بزرگوں کے حالات و کوائف سے متعلق گنتی کی دو چار سطریں بھی مرقوم نہیں۔ جہاں کہیں کچھ مذکور ہے تو اس کا تعلق ان کے مزارات سے ہے حالات و کوائف سے نہیں۔ یعنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے مزارات کہاں اور کس سمت میں واقع ہیں اور بس۔

حضرت سخی سرور کے خاص مریدین

جس طرح حضرت سخی سرور کے خلفا کی بابت ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں

علی، حضرت سخی سرور کے چار یار تھے اور جب آپ کے عزیزوں نے آپ پر حملہ کیا تو سب سے پہلے ان چار یاروں کو شہادت ملی۔ (سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۲۲) ۔ لارڈ۔ ایم میکالف نے لکھا ہے کہ یہ بزرگ ایک جنگ کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ (دیکھیں CALCATTA REVIEW, VOL 60, P

[1] سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۲۲-۲۳۔

اسی طرح آپ کے خاص مریدوں کے متعلق بھی کافی معلومات موجود نہیں۔ ہمیں کسی ماخذ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کے حلقۂ ارادت میں کون کون بزرگ شامل تھے اور کس کس پر آپ کی خاص عنایت تھی۔ تحقیقاتِ چشتی کے مطالعہ سے اتنا پتا چلتا ہے[1] کہ بکن واگی اور شیخ گاڑھا نام کے دو شخص حضرت سخی سرور کے خاص خدمت گزار تھے۔ اول الذکر آپ کے بھائی سیّد عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا سے بھی وابستہ تھا۔ اور آخر الذکر ہر وقت آپ کی خدمت میں کمربستہ رہتا تھا۔ خاص مریدوں کی جو خصوصیات ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ شیخ گاڑھا میں موجود تھیں۔ چنانچہ تحقیقاتِ چشتی میں مذکور ہے[2] کہ شیخ گاڑھا حضرت سخی سرور کو وضو کرایا کرتا تھا اور آپ کی گھوڑی پر، جو ککّی گھوڑی کے نام سے مشہور ہے، زین کسنے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ جب دشمنوں نے آپ پر حملہ کیا اور آپ کو بے رحمی سے شہید کر دیا تو بکن واگی اور شیخ گاڑھا ہی نے آپ کو دفنانے کا کام انجام دیا۔ حضرت سخی سرور نے دمِ واپسیں شیخ گاڑھا سے یہ کہا تھا کہ ہمیں دفنانے کے بعد تم شہر بہ شہر اور قریہ قریہ پھرنا اور ہمارا مصلیٰ، تیغا اور آفتابہ جگہ بہ جگہ لے جانا۔ لوگ تمہارے حلقۂ ارادت میں جوق در جوق داخل ہوں گے اور ہمارے تمام عقیدتمند اور مرید تمہاری خوب آؤ بھگت اور عزت کریں گے۔

ان دو چار باتوں کے علاوہ جو اوپر درج کی گئی ہیں ہمیں بکن واگی اور شیخ گاڑھا کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ دونوں کون تھے؟ کس مذہب ملّت اور فرقے سے تعلق رکھتے تھے؟ ان کے آبا و اجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟ وہ خود کہاں مقیم تھے؟ اور وہاں سے پہلے کہاں سے آئے اور حضرت سخی سرور کے ساتھ کب وابستہ ہوئے؟ ان کا بچپن یا لڑکپن کہاں گزرا؟ آیا حضرت سخی سرور سے ملاقات کے وقت وہ جوان تھے یا عمر رسیدہ۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں ہمیں کسی ماخذ سے معلوم نہ ہو سکیں۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں مزید کچھ بیان کرنے سے قاصر ہیں اور حضرت سخی سرور کے خاص مریدوں کا ذکر یہاں چھوڑ کر یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت سخی سرور کے عام مریدوں میں کس قسم کے لوگ شامل تھے اور

---

[1] تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۱۱-۲۱۲ [2] ایضاً

ان کے حالات و کوائف کیا تھے[1]

حضرت سخی سرور کے عام مریدین

حضرت سخی سرور کی خدمت میں حاضر ہونے والے تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کو ہم عام مریدوں کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی تعداد خاصی بتائی جاتی ہے۔ ہر ایک مرید کا حال جداگانہ طور پر معلوم کرنا تو ہمارے بس کی بات نہیں اور نہ کسی ماخذ میں اس قسم کی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ تذکروں یا کتابوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سخی سرور کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر تین آدمی حاضر ہوئے جن میں ایک کوڑھی، دوسرا نابینا اور تیسرا نامرد تھا۔ پہلے کا نام بعض جگہوں پر گوہر[2] اور بعض جگہوں پر بہرام[3] مذکور ہے۔ دوسرے کا نام کسی نے ہبرت نگاہی[4]، کسی نے دسترت[5] اور کسی نے جبرت منگاہ[6] لکھا ہے۔ تیسرے کا نام تقریباً سب مقامات پر احمد خان افغان مرقوم ہے۔
غرض یہ تینوں آدمی حضرت سخی سرور کی شہادت کے بعد آپ کے روضۂ مبارک پر حاضر ہوئے

---

[1] ایچ۔ اے۔ روز نے لکھا ہے کہ سید نورنگ شاہ ایک معروف بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے والد قاسم شاہ، جن کی خانقاہ ڈیرہ غازی خاں میں واقع ہے، سندھ سے یہاں تشریف لائے اور ان کے صاحبزادے نورنگ شاہ بارہ سال متواتر حضرت سخی سرور سے وابستہ رہے۔ وہ اپنی کرامات میں بہت مشہور ہوئے۔ ان کی اولاد اور جانشین ان کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ملاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو. GLOSSARY, VOL 1, P 568)
اس لحاظ سے ممکن ہے کہ سید نورنگ شاہ بھی حضرت سخی سرور کے مخصوص مریدوں میں سے ایک ہوں۔

[2] GLOSSARY, VOL 1, P 567-68. ، PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134.

[3] سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۱۹۔

[4] GLOSSARY, VOL 1, P 567-68. ، PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134.

[5] سوانح حیات حضرت سخی سرور، ص ۱۹

[6] تواریخ ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۴۔

اور قدرتِ الٰہی سے صحت یاب ہوگئے۔ تندرستی ملنے کے بعد تینوں آپ کے مرید بن کر خانقاہ کی مجاوری کرنے لگے۔ ان کے بعد ان کی اولاد یہ فرائض انجام دیتی رہی۔ اس طرح پشت در پشت یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ یہاں تک پہنچا۔ بعض کتابوں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ان مریدوں کی اولاد تین حصّوں میں تقسیم ہوگئی تھی یعنی کلنگ، کاہن اور شیخ[1]۔ کہا جاتا ہے کہ ان مجاوروں کی

---

[1] اس سلسلے میں بعض روایتیں یوں بیان کی گئی ہیں کہ حضرت سخی سرور کے خسر گھنو خان پٹھان، حاکم ملتان کے تین مصاحب حضرت سخی سرور کے معتقد ہونے کی وجہ سے آپ کی خانقاہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان کے نام کلنگ، کاہن اور شیخ تھے۔ موجودہ مجاور انہی تینوں کی اولاد ہیں۔ ان مجاوروں کی تعداد ہمیشہ ۱۶۵۰ رہتی ہے۔ اور یہ حضرت سخی سرور کی کرامت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کبھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ تعداد کی تفصیل باعتبار ذیل بتائی جاتی ہے:-

کلنگ کی اولاد	:	۷۵۰
کاہن کی اولاد	:	۶۰۰
شیخ کی اولاد	:	۳۰۰
میزان	:	۱۶۵۰

محکمہ اوقاف کی تحویل میں آنے سے پیشتر یعنی ۱۹۶۰ سے قبل خانقاہ کے چڑھاووں کی آمدنی ۱۶۵۰ حصوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ عورتیں اور بچے بھی اس آمدنی میں برابر کے حصے کے حقدار ہوتے تھے۔ ایچ۔ اے روز کا بیان ہے کہ مریدوں کی تعداد کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مردم شماری کی جو رپورٹیں وقتاً فوقتاً مرتب ہوتی رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تعداد میں کبھی کمی اور بیشی ہو جاتی ہے۔ (دیکھیں GLOSSARY, VOL I, P 567-68. اور PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134.)۔ منشی حکم چند نے اس باب میں لکھا ہے کہ پنجاب کے زمیندار ہندو اور مسلمان حضرت سخی سرور کے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ گوہرا نامی جزامی، قوم کلنگ۔ جرت منگاہ اور احمد خان افغان خانقاہ پر حاضر ہوئے۔ گوہرا کا جزام دور ہو گیا۔ جرات کی نابینائی چلی گئی اور احمد خان کا مرض بھی جاتا رہا۔ پھر یہ تینوں بطور مجاور خانقاہ کی خدمت کرنے لگے اور تب سے

اولاد کی تعداد ۱۶۵۰ سے کبھی متجاوز نہیں ہوئی اور تعداد کا ہمیشہ یکساں رہنا دراصل حضرت سخی سرور کی کرامت کا نتیجہ ہے[۱] محکمہ اوقاف کی تحویل سے قبل خانقاہ کے چڑھاووں اور نذرانوں کو ۱۶۵۰ مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔

مذکورہ بالا اندراجات سے اخذ ہوتا ہے کہ حضرت سخی سرور کے عام مریدین، جو کسی قدر ان مریدوں سے اونچا درجہ رکھتے ہیں جن کا تعلق عوام سے ہے اور جن کا ذکر ہم آگے کریں گے، ایک محدود تعداد میں موجود ہیں۔ جو ایک روایت کی رُو سے ۱۳۵۰ اور دوسری روایت کی رو سے ۱۶۵۰ سے متجاوز نہیں۔

عوام پر حضرت سخی سرور کا اثر

ان مریدوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، حضرت سخی سرور کے عقیدتمندوں میں اور بہت سے لوگ نظر آتے ہیں جو برّصغیر پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے کم و بیش ہر شہر اور

ان تینوں کی اولاد خانقاہ کی مجاور چلی آتی ہے۔ مجزوم کی اولاد کلنگ، نابینا کی کاہن اور پٹھان کی شیخ کہلاتی ہے۔ تینوں کی اولاد چڑھاوے کی آمدنی شرعی حصص پر تقسیم کر لیتی ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مجاوروں کی تعداد ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ اگر کوئی نیا شخص پیدا ہوتا ہے تو اس کی جگہ کوئی مر جاتا ہے۔ غرض تعداد میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی (ملاحظہ ہو: تواریخ ضلع ڈیرہ غازیخاں، ص ۴۴)۔ منشی سبحان رائے نے بھی یہ بات بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: سہ کس یکی نابینا دوم مبروص وسومی نامرد مجاورت مزار اختیار کردہ استدعا رفع علل خود ہا نمودند۔ بقدرت ایزدی نامرد رجولیت و مبروص تندرستی و نابینا بینائی یافت۔ و موجب مزید اعتقاد طوائف انام گردید۔ این ساعۃ غریبہ شہرت پذیرفت۔ چون نابینائی مذکور راکاہ و کلنگ در بادی النظر بنظر درآمدہ آن سہ کس بدین نام مشہور شدند۔ و اولاد آن ہا راکہ مجاورت مزار دارند تاحال کاہ و کلنگ نامند۔ (دیکھیں خلاصۃ التواریخ، ص ۶۲۔ نیز ملاحظہ ہو: خزینۃ الاصفیاء، ج اول، ص ۴۰۳۔ ج دوم، ص ۲۴۸)

۱۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134. ‹ GLOSSARY, VOL 1, P567-68.

گاؤں میں موجود ہیں۔ ان لوگوں میں مذہب کی کوئی قید نہیں۔ مسلمان بھی کثرت سے آپ کے معتقد ہیں اور ہندو بھی۔ تقسیم ہند سے پیشتر آپ کے سالانہ عرس میں یہاں کی تینوں بڑی قومیں یعنی مسلمان ہندو اور سکھ بھاری تعداد میں شرکت کرتی تھیں۔

ہم سوانح حیات کے باب میں یہ بات لکھ چکے ہیں کہ حضرت سخی سرور ایک جگہ جم کر کبھی نہیں بیٹھے۔ چنانچہ بغداد اور چشت کے علاوہ جہاں آپ روحانی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے، برصغیر پاک و ہند کے مختلف مقامات خصوصاً پنجاب کے متعدد علاقوں مثلاً شاہکوٹ (سکوٹ)، ملتان، سوہدرہ، دھونکل اور ڈیرہ غازیخاں وغیرہ میں گھومتے پھرتے رہے۔ تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے، خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ خدمت میں حاضر ہو کر حلقۂ ارادت میں شامل ہو جاتے۔ بعینہٖ جیسے سلطان المشائخ، حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں لوگ حاضر ہو کر بیعت ہوتے تھے۔ حضرت سخی سرور ہر آنے والے کا خیر مقدم کرتے اور اس کی ذہنی و روحانی اصلاح و تربیت کے لئے ہر ممکن کوشش فرماتے۔ آپ کے پاس آنے والوں کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا تھا۔ ہر ایک اپنی مراد لے کر واپس جاتا۔ نامرادی کا اسے کبھی منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ اس طرح آپ کی مقبولیت لوگوں میں روز بروز بڑھتی گئی۔

یہاں تک کہ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں سکھ بھی اس زمرے میں داخل ہوئے۔ اگرچہ اس وقت حضرت سخی سرور زندہ نہیں تھے بلکہ وفات پا چکے تھے۔ تاہم آپ کے ماننے والوں کی تعداد روز افزوں ہوتی رہی۔ تقسیم ہند سے قبل اس برصغیر کی سب بڑی قومیں یعنی مسلمان، ہندو اور سکھ آپ کے مزار اقدس کی زیارت کو جایا کرتیں اور سالانہ عرس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھیں۔

ایچ اے روز اور ایڈورڈ مکلیگن لکھتے ہیں[1] کہ جب مردم شماری کی رپورٹ مرتب کی گئی تو برصغیر پاک و ہند بالخصوص پنجاب کے ہر ضلع، ہر شہر حتیٰ کہ ہر گاؤں میں حضرت سخی سرور

---

[1] GLOSSARY, VOL 1, P 565.
PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134

کے عقیدت مند بھاری تعداد میں موجود تھے - اور انھوں نے اپنے نام کچھ اس طرح رکھے ہوئے تھے -

سرور یہ - سلطانیہ - سلطانیہ سلطان ودیوی - سیوک سلطانی - سناتھن - دھرم سرور یہ سخی سیوک - ہندو سلطانی - سرور یہ سلطانیہ - نگاہیہ - سلطان پیریا - سخی سرور - سیوک سخی سرور - سرور ساگر - لکھ داتا - سلطانی رام رائے - گورو سلطانیہ - نگاہیہ پیر - دھونکل سیوک - خواجہ سرور - لالانوالہ وغیرھم -

حضرت سخی سرور کے عوامی عقیدتمندوں اور مریدوں کا حال معلوم کرنے کے لئے ہمیں تقریباً پورے برصغیر پاک و ہند اور خاص طور پر متحدہ پنجاب کے سارے سرکاری گزیٹر اور مردم شماری کی مختلف رپورٹیں دیکھنی پڑیں - ہر جگہ آپ کے ماننے والوں کا سراغ ملا - پاکستان میں ڈیرہ غازی خاں سے پشاور تک اور بھارت میں امرتسر سے سہارن پور تک، جہاں سے یو-پی کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، آپ کے عقیدت مند اور مرید بکثرت موجود ہیں - ہر ایک گزیٹیر یا رپورٹ کا فرداً فرداً جائزہ لینا تو یہاں مشکل ہے تاہم ایک بات جو سب میں مشترک دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے معتقد ہر جگہ کم یا زیادہ تعداد میں موجود ہیں اور ان کی رسمیں کم وبیش ایک جیسی ہیں - ذیل میں ہم ایک دو سرکاری گزیٹیروں کا جائزہ لیتے ہیں -

جالندھر ڈویژن کے گزیٹیر میں لکھا ہے[۱] کہ "اس ضلع کی آبادی دو بڑے حصوں میں منقسم ہے یعنی مسلمان اور ہندو - ان کی آپس میں نسبت پانچ اور چھ کی ہے - سکھ در حقیقت ہندو ہیں اور ہندو ہی سمجھے جاتے ہیں - ہندو آبادی اجمالی طور پر دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے گرو کے سکھ یعنی خالص سکھ اور سلطانی یعنی ایک مسلمان پیر، حضرت سخی سرور کے پیرو، جنھیں لکھ داتا بھی کہتے ہیں - اور جو چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی میں ظہور پذیر ہوئے - ان کا اصل نام سید احمد (سلطان) ہے اور ان کی خانقاہ یا زیارت گاہ نگاہہ (سخی سرور) میں موجود ہے، جو ڈیرہ غازی خاں میں واقع ہے۔"

---

۱ JALLUNDER GAZETTEER, P 121.

اسی گزیٹیر میں ذرا آگے چل کر مذکور ہے[1] کہ "زراعت پیشہ ہندوؤں میں سلطانیوں کی اکثریت ہے اور ان میں کئی چمار بھی ہیں۔ سلطانی ہندو اگر گوشت کھاتے ہیں تو صرف حلال کیا ہوا۔ وہ سکھوں کے برخلاف حقّہ وغیرہ خوب پیتے ہیں اور سر کے بال جس طرح چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یعنی سکھوں کی طرح ان پر یہ بندش نہیں کہ وہ اپنے بال بڑھائیں۔ ان کے دیہات میں سلطان (سخی سرور) کی زیارتیں ہوتی ہیں، جن کے بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اینٹوں کی ایک مکعب نما خالی عمارت ہوتی ہے۔ آٹھ یا دس فٹ کے قریب اونچی۔ چوڑی اور لمبی۔ جس کے اوپر ایک گنبد ہوتا ہے اور چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہوتے ہیں۔ ہر جمعرات کو یہ زیارت صاف کی جاتی ہے اور رات کو چراغ جلائے جاتے ہیں۔ جمعرات کو اس زیارت کا نگہبان، جو عام طور پر مسلمان اور بھرائی قوم کا فرد ہوتا ہے، گاؤں میں ڈھول لے کے جاتا ہے اور نیاز اکٹھی کرتا ہے۔ اس زیارت کو سلطان کا تھاؤں، یا نگاہہ، یا تھان یا جگی اور عموماً پیر خانہ کہتے ہیں۔"

ضلع لدھیانہ کے سرکاری گزیٹیر میں بھی اسی قسم کا اندراج ہے۔ اس میں لکھا ہے[2] کہ "ہندوؤں کے تمام فرقوں کی تفصیل میں جانے کا تو موقع نہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ سلطانیوں کی بابت کچھ تحریر کر دیا جائے، جن میں زیادہ تر ہندو جاٹ شامل ہیں۔ یہ حضرت سخی سرور کے پیرو ہیں۔ ابھی تک اس امر کا پتا نہیں لگایا جا سکا ہے کہ سلطان کی پرستش اس ضلع میں کب شروع ہوئی لیکن کہا جاتا ہے کہ جاٹ گزشتہ تین چار سو سال میں یہ عقاید اپنے ساتھ یہاں لائے۔ یہ امر غالب ہے کہ سلطانی عقاید نویں اور دسویں صدی ہجری مطابق پندرھویں اور سولھویں عیسوی کے درمیان مغربی پنجاب سے مشرق کی طرف پھیلتے گئے اور گورو گوبند سنگھ[3] کے زمانے میں قریباً سبھی جاٹ

---

[1] JALLUNDER GAZETTEER, P 124. GLOSSARY, VOL 1, P 567-68.

PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134.

[2] LUDHIANA GAZETTEER, 1888-1889, P 83-82.

[3] سکھوں کے آخری گورو جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انھوں نے سکھوں کو اپنے ناموں کے ساتھ سنگھ کا

سلطانی تھے۔ کیونکہ جو ہندو سکھ ہوئے تھے وہ سلطانیوں میں سے تھے۔ سلطانی ظاہراً عام ہندوؤں کی طرح ہیں۔ شو یا دیوی کے پجاری۔ لیکن جمہور کے ہندو مذہب کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ پیر اور اس کے پیر خانہ نے محسوس ہونے کی بنا پر دیوتاؤں کو بالکل نکال دیا ہے۔"

ہم نے صرف دو سرکاری گزیٹیرؤں سے حضرت سخی سرور کے عام عقیدتمندوں اور ہندو مریدوں کا حال درج کیا ہے۔ کم و بیش دوسرے اضلاع کے گزیٹیروں میں بھی اسی قسم کے اندراجات ہیں، جن کے نقل کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ جو صاحب اس تفصیل کو جاننے کے آرزومند ہیں انھیں چاہیئے کہ مختلف اضلاع کی سرکاری دستاویزوں کی طرف رجوع کریں، جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہیں۔

غالباً حضرت سخی سرور کی اسی مقبولیت کے پیش نظر شیخ اکرام نے اپنی کتاب آب کوثر میں لکھا ہے[۱] کہ حضرت سخی سرور کو گزرے آٹھ صدیاں ہو چکی ہیں لیکن آج بھی برصغیر پاک و ہند بالخصوص پنجاب میں آپ کا کافی گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ صاحب سطوت بزرگ تھے۔ شاید ہی کوئی مسلمان بزرگ ہو گا جس کے اس کثرت سے ہندو معتقد ہوں۔ آپ کے ہندو معتقدوں کو سلطانی کہا جاتا ہے۔ سلطانیوں کی عقیدتمندی کا ذکر کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کی رسموں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہ کیسی تھیں اور کیا ہیں۔

اضافہ کرنے کو کہا تھا۔ پہلے گورو نانک تھے۔ من حیث المجموع سکھوں کے کل دس گورو گزرے ہیں جن کے نام یہ ہیں: گورو نانک۔ گورو انگد۔ گورو امرداس۔ گورو رام داس۔ گورو ارجن صاحب۔ گورو ہرگوبند۔ گورو ہررائے۔ گورو ہرکشن۔ گورو تیغ بہادر۔ گورو گوبند سنگھ۔ ان کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تحقیقات چشتی، ص ۱۳۱-۱۷۵، اور ۱۵۴-۱۵۵

[۱] آب کوثر، ص ۹۲۔ نیز دیکھیں، چشمۂ کوثر، ص ۸۲۔

سلطانیوں کی رسمیں

شیخ اکرام لکھتے ہیں[1] کہ سلطانیوں کی سب سے بڑی رسم حضرت سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے، جو وسط فروری کے قریب شروع ہوتی ہے اور بھرائی اپنے اپنے دیہات سے قافلے لے کر ڈیرہ غازی خاں کا رخ کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل ہم نے علیحدہ طور پر بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ ایچ اے روز نے بھی سلطانیوں کی بعض رسموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ کلمہ سلطانی کے ذیل میں لکھتے ہیں[2] کہ سلطان سخی سرور کے پیرو سلطانی کہلاتے ہیں۔ ان کو اور ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے مثلاً سروریہ، نگاہیہ، لکھ داتا، دھونکلیہ[3] وغیرہ۔ سروریوں یا سلطانیوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ جھٹکے سے اجتناب کرتے ہیں۔ یعنی وہ کبھی ایسے جانور کا گوشت نہیں کھاتے جس کو مسلمانوں کے مروجہ حلال طریقے پر ذبح نہ کیا گیا ہو۔ تمام سلطانی جمعرات کا احترام کرتے ہیں اور اس دن اپنی مرادوں کے پورا ہونے کے لئے خیرات دیتے ہیں۔ سلطانیوں کا اطلاق یوں تو ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو حضرت سخی سرور سے عقیدت رکھتا ہے، لیکن خاص طور پر یہ کلمہ ان ڈھولیوں کے لئے مخصوص ہے جو آپ کی یاد میں مختلف گیت گاتے ہیں۔ علاوہ ازیں سدھو جاٹ عورت، جو دانی جٹی[4] کے نام سے مشہور ہے، کی اولاد

---

[1] آبِ کوثر، ص ۹۳، چشمۂ کوثر، ص ۸۳۔ نیز دیکھیں تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۳۰۔

[2] GLOSSARY, VOL III, P435-37. بحوالہ پنجابی ڈکشنری، ص ۱۰۷۸۔ نیز دیکھیں:
PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 136.

[3] دھونکلیہ، دھونکل سے بنایا گیا ہے جو وزیر آباد کے قریب ضلع گوجرانوالہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سخی سرور نے دھونکل میں کافی عرصہ قیام کیا تھا۔ اور دورانِ قیام لوگوں کو ارشاد و ہدایت سے مستفیض فرمایا تھا۔ زائرین جب حضرت سخی سرور کے مزار واقع ڈیرہ غازی خاں کی زیارت کو جاتے ہیں تو دھونکل میں بھی کچھ دن قیام کرتے ہیں۔ (دیکھیں: GLOSSARY, VOL III, P435.)

[4] دانی جٹی فیروز پور کی تحصیل موگا (MOGA) میں واقع ایک جگہ ہے جس کا نام لانڈیکہ (LANDEKE)

بھی اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔

سلطانیوں کی رسموں کے متعلق رپورٹ مردم شماری (۱۸۹۲ء) میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم ذیل میں اس کے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

مذکورہ رپورٹ میں لکھا ہے[1] کہ حضرت سخی سرور کے نام پر پنجاب کے تقریباً ہر گاؤں میں ایک زیارت بنی ہوئی ہے جو مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ مثلاً سلطان دا تھاؤں۔ نگاہہ۔ صرف تھان یا جگی۔ لیکن زیادہ مشہور نام پیر خانہ ہے۔ ہر گاؤں میں پیر خانہ بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ایک پکے چبوترے پر اینٹوں کی مکعب نما خالی عمارت ہوتی ہے۔ آٹھ دس فٹ کے قریب اونچی، چوڑی اور لمبی۔ اس کے اوپر دس بارہ فٹ اونچا ایک گنبد ہوتا ہے۔ چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہوتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک دروازہ ہوتا ہے جو چبوترے کے اوپر سامنے کی طرف کھلتا ہے۔ دروازے سے اندر داخل ہوں تو عین سامنے کی جانب دو تین طاقیں ہوتی ہیں جن میں چراغ رکھے جاتے ہیں۔ یہ عمارت جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اندر سے بالکل خالی ہوتی ہے ہر جمعرات کو پیر کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس دن زیارت کو صاف کیا جاتا ہے اور رات کو چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ زیارت کا نگہبان بھرائی قوم کا فرد اور عموماً مسلمان ہوتا ہے وہ جمعرات کو ڈھول لیکر نکلتا اور نیاز اکٹھی کرتا ہے، جو نقدی، غلے یا کپاس کی صورت میں ہوتی ہے اور بالعموم عورتوں کی طرف سے دی جاتی ہے۔

سلطانیوں کی ایک اور رسم، جس کے ذریعے وہ اپنے پیر کو خوش کرتے ہیں، یہ ہے کہ ایک

ہے۔ حضرت سخی سرور کے مزار کی زیارت کو گئی تھی۔ شروع میں بے اولاد تھی۔ شادی کے کوئی گیارہ بارہ سال بعد حضرت سخی سرور کی کرامت سے اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بعد میں اس نے پیر کی منت پوری نہ کی تو وہ لڑکا مر گیا۔ دانی حضرت سخی سرور کے مزار پر جاکر روئی۔ آخر آپ کی کرامت اور قدرتِ الٰہی سے لڑکا زندہ ہوگیا۔ دانی جٹی کی اولاد اب تک سلطانی کہلاتی ہے۔ (GLOSSARY, VOL III, P 435.) دانی جٹی کا مکمل قصہ ایک بہت ہی مشہور گیت میں بیان ہوا ہے، جو کتاب ہذا کے ضمیمے میں شامل ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب ہذا، ص ۳۰۴)

[1] GLOSSARY, VOL III, P435. ' PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 136

روٹ کی منت مانی جاتی ہے۔ اس کی تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ ایک صاف ستھری جگہ پر آگ جلا کر اسے توے کی طرح تپا لیتے ہیں۔ جب جگہ تپ کر تیار ہو جاتی ہے تو آگ کے انگارے وہاں سے ہٹا کر جگہ کو صاف کر لیتے ہیں۔ پھر اس جگہ پر بقدر استطاعت ایک روٹ تیار کیا جاتا ہے اور جب روٹ تیار ہو جاتا ہے تو لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بعض سلطانی گھرانوں میں ہر سال جمعہ کے دن ایک مخصوص روٹ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ روٹ ظاہر ہے کہ روٹی کا اسم مکبّر ہے اور عام طور پر ایک من آٹے اور ایک من گڑ کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ روٹ کی تیاری کے دوران پیر خانے کا نگہبان، بھرائی ڈھول بجاتا اور حضرت سخی سرور کی یاد میں تعریفی گیت گاتا رہتا ہے۔ جب روٹ پک کر تیار ہو جاتا ہے تو بھرائی اس کا ایک چوتھائی خود رکھ لیتا ہے اور باقی تین چوتھائی گھر کے مالک اور اس کے پڑوسی آپس میں تقسیم کر کے کھا لیتے ہیں۔

سلطان کی عقیدت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سلطانی کبھی کبھار بستر پر سونے کی بجائے زمین پر سوتے ہیں۔ ان کا یہ عمل سلطانیوں کی اپنی اصطلاح میں چوکی بھرنا کہلاتا ہے[۱]

سلطان کی یاد میں دنگل یعنی کشتیاں بھی ہوتی ہیں۔ انھیں اصطلاح میں چنگ باجانی کہا[۲]

ف۱ اس امر کی تصدیق مسٹر لونگ ورتھ ڈیمز (LONG-WORTH DAMES) GLOSSARY, VOL III, P 436. کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ڈیرہ غازی خاں میں جہاں حضرت سخی سرور کا مزار واقع ہے۔ وہاں کوئی بستر رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہاں کے باشندے جو زیادہ تر دربار کے مجاور ہیں، اور وہ زائرین جو زیارت کے لئے یہاں آتے ہیں، سب بستر کی بجائے زمین پر سوتے ہیں۔ PUNJAB NOTES AND QUERIES, VOL1, MARCH, 1884, P61.

نیز دیکھیں VOL 1, SEPT, 1884, P133. اور VOL III, MAY, 1893, P36.

ف۲ ڈبلیو۔ ایف ڈی گروتھر (W.F.D-GRUYTHER) GLOSSARY, VOL III, 436. CHING BAJANI لکھتے ہیں کہ چنگ باجانی (CHING BAJANI) ایک قسم کا کشتیوں کا مقابلہ (WRESTLING MATCH) ہوتا ہے۔ اس میں تماشائی پہلوانوں کو نذرانے دیتے ہیں۔ پہلوان ان نذرانوں کو

جاتا ہے۔ ان کشتیوں سے جو آمدنی چڑھاوؤں یا نقدی کی صورت میں ہوتی ہے، اُسے دربار سخی سرور، واقع ڈیرہ غازی خاں کی نگہداشت پر صرف کیا جاتا ہے۔

سلطانیوں کی رسموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جمعرات کے دن کوئی سلطانی دودھ نہیں بیچتا۔ اس دن دودھ کو یا تو وہ خود استعمال کر لیتا ہے یا بغیر قیمت وصول کئے لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ کسی حال میں بھی وہ دودھ کو فروخت نہیں کرتا۔

حضرت سخی سرور خاص طور پر جاٹوں کے پیر ہیں لیکن جھینور[1]، گوجر اور نچلے طبقے کی دوسری ذاتوں کے لوگ بھی آپ سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ عورتیں آپ کی خاص عقیدتمند ہیں۔ ان میں کھترانی اور برہمن ذات کی عورتیں بھی کثرت سے نظر آتی ہیں۔ ایڈورڈ مکلیگن لکھتے ہیں[2] کہ حضرت سخی سرور کا اثر بظاہر پنجاب پر دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے باہر بھی آپ کا بڑا اثر ہے۔ کرنال میں آپ کے مخصوص معتقدین میں گوجر اور راجپوت قوم کی عورتیں ملتی ہیں جو ساون کے مہینے میں آپ کا جشن مناتی ہیں۔ دہلی میں آپ کی اتنی مقبولیت نہیں جتنی کہ پنجاب میں ہے، تاہم وہاں بھی گاؤں گاؤں آپ کی زیارتیں نظر آتی ہیں۔ سر ڈین زل ابٹسن کا کہنا ہے[3] کہ دہلی میں بھی آپ کی زیارتوں پر لوگ کثرت سے آتے جاتے ہیں اور برہمن مخصوص دن اور تاریخ کو اپنے عقیدتمندوں کی کلائی پر جو دھاگے باندھتے ہیں، آپ ہی کا نام ان کے وردِ زبان ہوتا ہے۔ یعنی دھاگا باندھتے وقت وہ آپ ہی کا نام لیتے ہیں۔

ایچ اے روز نے لکھا ہے[4] کہ کسی بھی ذات کا کوئی بھی شخص، خواہ وہ چمار ہی کیوں نہ ہو، اپنے

دربار سخی سرور کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سخی سرور عرف لکھ داتا کشتیوں اور کھیلوں کے خاص مربی تھے۔ (دیکھیں PUNJAB NOTES AND QUERIES, VOL II AUG 1885, P 181-82.)

[1] JHAIN WAR.

[2] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 136.

[3] GLOSSARY, VOL 1, P 568.

[4] GLOSSARY. VOL III, P 436.

آپ کو حضرت سخی سرور کا پرستار کہہ سکتا ہے۔ ہر مذہب اور ہر قوم میں خصوصاً جاٹوں اور جھبنوروں میں آپ کے ماننے والے بکثرت موجود ہیں۔ حضرت سخی سرور نے اپنے عقیدتمندوں پر کبھی کوئی بندش یا پابندی عائد نہیں کی۔ نہ ہی آپ نے کچھ ایسی دشواریاں ان کی راہوں میں حائل کیں۔ جن کے باعث وہ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے سے گھبراتے۔ آپ نے سیدھے سادے انداز میں اپنی تعلیمات و تبلیغات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے پیروؤں کی تعداد دوسرے اولیا اور صوفیا کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

پنج پیر اور حضرت سخی سرور

حضرت سخی سرور سے ہندوؤں کی عقیدتمندی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے آپ کو پنج پیر کے زمرے میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سر ڈینزل ابٹسن اور ایڈورڈ میکلیگن رقمطراز ہیں[۱] کہ برصغیر پاک و ہند کے بعض علاقوں میں ہندو اپنے آپ کو پنج پیر یعنی پانچ بزرگوں کا پیرو بتاتے ہیں۔ لیکن یہ پانچ پیر کون ہیں اس کا فیصلہ خود پیرو کرتے ہیں۔ کسی کے نزدیک پنج پیر سے مراد شیعی عقاید کی پانچ مقدس شخصیتیں ہیں، جن کو پنج تن پاک بھی کہتے ہیں یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بی بی فاطمہ۔ حضرت علی۔ حضرت حسن اور حضرت حسین۔ کسی کے خیال میں کوئی سے پانچ مسلمان بزرگ پنج پیر کہلا سکتے ہیں مثلاً خواجہ معین الدین چشتی۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ شیخ نظام الدین اولیا۔ نصیر الدین ابو الخیر اور سلطان نصیر الدین محمود۔ یا خواجہ خضر۔ سیّد جلال۔ حضرت زکریا۔ لال شہباز اور بابا فرید گنج شکر۔ گوجرانوالے کے بھٹیوں کا عقیدہ ہے کہ پانچ بزرگ یعنی پنج پیر یہ ہیں: شیخ اسماعیل۔ شاہ دولہ۔ شیخ فتح علی۔ پیر فتح خان اور شاہ مراد۔ یہ تمام بزرگ بھٹیوں کے مربی مانے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے مرکزی اور مغربی علاقوں میں ہمیں پنج پیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کی تال میل نظر آتی ہے۔ اس فہرست میں سلطان سخی سرور۔ دیوی۔ گرو۔ خواجہ اور گوگا پیر

۱۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 137. اور GLOSSARY, VOL 1, P 572-73.

یا جیسا کہ لدھیانہ میں ہے، خواجہ خضر۔ درگا دیوی۔ وشنو۔ حضرت سخی سرور اور گورو گوبند سنگھ۔ یا جسطرح شملہ میں ہے، گوگا پیر۔ بالک ناتھ۔ ٹھاکر۔ حضرت سخی سرور اور شیو وغیرہ کے نام دکھائی دیتے ہیں۔

پنج پیر سے مراد دراصل یہ ہے کہ ایک پیرو اپنی مرضی کے مطابق کوئی سے پانچ بزرگوں کے نام چن کر ان کی پیروی کی جاتی ہے ——— ۔مظفر گڑھ سے لے کر دہلی تک پنج پیرے یعنی پانچ بزرگوں کے پرستار دکھائی دیتے ہیں۔ضلع شاہ پور میں، ساہیوال کے جنوب کی طرف، کوئی دس میل کے فاصلے پر ایک جگہ ہے، جہاں پنج پیر کی یاد میں ہر سال ایک بھاری میلہ لگتا ہے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو چہار پیر یعنی چار بزرگوں کا پیرو بتاتے ہیں اور چہار پیر سے بالعموم آنحضرتؐ کے چار یار مراد ہوتے ہیں جن کے معتقد مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں بکثرت موجود ہیں۔

ساتواں باب

عرس اور میلے

سر ڈینزل ابٹسن اور ایڈورڈ مکلیگن نے لکھا ہے[1] کہ یوں تو برصغیر پاک وہند خصوصاً پنجاب کے تقریباً ہر شہر اور ہر گاؤں میں حضرت سخی سرور کی یاد میں زیارت گاہیں بنی ہوئی ہیں جہاں عرس اور میلے ہوتے رہتے ہیں لیکن زیادہ اہم وہ مقامات ہیں جہاں بڑے پیمانے پر عرس اور میلے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں مغربی پاکستان میں دھونکل، پشاور، لاہور، ڈیرہ غازی خاں اور بھارت میں لدھیانہ اور بعض دوسرے مقامات قابلِ ذکر ہیں۔ ان مقامات پر ہر سال عرس اور میلوں کی وجہ سے بڑی دھوم دھام اور رونق ہوتی ہے۔ ذیل میں فرداً فرداً ہر ایک کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ دھونکل کا میلہ

جیساکہ سوانح حیات کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت سخی سرور نے بغداد سے علوم روحانی کی تکمیل کرنے کے بعد کچھ عرصہ دھونکل میں قیام فرمایا تھا۔ دھونکل میں جو میلہ ہر سال حضرت سخی سرور کی یاد میں لگتا ہے اس کی بابت مختلف کتابوں میں کچھ باتیں مذکور ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر دو ایک کتابوں کے اقتباسات یہاں درج کر دیئے جائیں۔

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. ، GLOSSARY, VOL 1, P 570.

تاریخ گوجرانوالہ میں لکھا ہے[1] کہ جب حضرت سخی سرور نے دھونکل کو اپنے قیام کا شرف بخشا اور یہاں عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوئے تو آپ کی برکت سے یہاں ایک چشمہ جاری ہوگیا۔ شاہجہان کے عہد میں مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی[2] نے آپ کے عبادتخانے

---

[1] تاریخ گوجرانوالہ، ص ۳۳

[2] مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے وقت کے ممتاز علما میں سے تھے۔ آپ مولانا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے۔ حضرت احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی سے آپ کو گہری عقیدت تھی۔ حضرت مجددؒ آپ کو آفتاب پنجاب کہتے ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں آپ اپنے وطن سیالکوٹ میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ جب شاہجہان سریر آرائے سلطنت ہوا اور علما و فضلا کی قدر دانی کے اعتبار سے اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی تو آپ کو بھی شاہی دربار میں بلالیا گیا، اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہان نے دو مرتبہ آپ کو چاندی میں تلوایا اور وہ چاندی آپ کو بخش دی۔ ہر مرتبہ چھ ہزار روپیہ وزن نکلا۔ علاوہ ازیں چند دیہات بھی آپ کو جاگیر میں عطا ہوئے اور تاعمر ایک لاکھ روپیہ سالانہ سلطان وقت کی جانب سے بطور وظیفہ ملتا رہا۔ آپ نے اپنی تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزاری۔ آخر ۱۶ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء کو انتقال ہوا اور سیالکوٹ میں دفن کیا گیا۔ آپ کی تصانیف تو بہت زیادہ ہیں لیکن مشہور یہ ہیں: حاشیۂ تفسیر بیضاوی۔ تکملۂ حاشیہ عبدالغفور بر فوائد ضیائیہ۔ ترجمہ فارسی غنیۃ الطالبین۔ حاشیہ مقدمات اربعہ تلویح۔ حاشیہ مطول۔ حاشیہ شرح مواقف۔ حاشیہ شرح عقائد تفتازانی۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی۔ حاشیہ بر حاشیہ ضیائی۔ حاشیہ شرح شمسیہ۔ حاشیہ شرح مطالع۔ الدرالثمینۃ فی اثبات الواجب تعالیٰ۔ حواشی بر ہوامش۔ شرح حکمۃ العین۔ حواشی بر ہوامش ہدایۃ الحکمۃ میبذی۔ حواشی بر ہوامش مراح الارواح۔ (تذکرہ علمائے ہند، اردو، ص ۲۸۰۔ ۲۸۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ احوال مشائخ کبار، ورق ۴ الف۔ ماثرالکرام، دفتر اول، ص ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ رودِ کوثر، ص ۳۲۴۔ ۳۲۶۔ خزینۃ الاصفیا

کی جگہ ایک پختہ مسجد بنوادی اور چشمے کو کنوئیں میں تبدیل کرادیا۔ بعدازاں سکھوں کے عہدِ حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کنوئیں کی حفاظت کے لئے اس پر ایک گنبد تعمیر کرادیا۔ یہاں ہر سال اوّل جمعرات ماہ ہاڑ سے اوّل جمعرات ماہ ساون تک، ایک مہینہ برابر میلہ رہتا ہے اور ہر طرف سے لوگوں کا ہجوم آتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جہاں اور شہروں کی آبادی اور رونق میں اضافہ ہوا وہاں دھونکل بھی پیچھے نہیں رہا۔ اب اس کی وہ حالت نہیں جس کا ذکر تاریخ گوجرانوالہ میں کیا گیا ہے۔ یہاں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے ہر وقت چہل پہل رہتی ہے اور میلے کے دنوں میں تو خوب گرما گرمی ہوتی ہے۔

عبرت نامہ میں لکھا ہے[1] کہ وزیر آباد سے تھوڑے فاصلے پر ایک موضع واقع ہے۔ جس کو عرفِ عام میں دھونکل کہتے ہیں۔ یہاں مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی نے شاہ جہان کے زمانے میں ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کی تعمیر کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سخی سرور کے مرید اور عقیدت مند جب لاکھوں کی تعداد میں دھونکل کے میلے میں شریک ہوتے ہیں تو آپ کے حجرۂ عبادت کو سجدہ کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحکیم نے لوگوں کی اس روش کو خلافِ شرع قرار دیا اور انھیں اس طرح سجدہ کرنے سے منع کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لوگ بدستور سجدہ کرتے رہے۔ آخر مولوی عبدالحکیم نے حضرت سخی سرور کے حجرہ کو ایک مسجد میں منتقل کرادیا۔ ان کا خیال تھا کہ جو کوئی یہاں آئے گا، دوگانہ نماز پڑھیگا اور طریق آداب بجالائے گا۔ اس طرح آئین شرع کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ لوگ اسی طرح یہاں نماز پڑھتے رہے لیکن اسلام کے ضعف کی وجہ سے جاہل عوام دوگانہ نماز ادا کرنے

جلد دوم، ص ۳۵۱۔ سبحۃ المرجان، ص ۶۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ تواریخ سیالکوٹ ص ۸۳۔ ۸۹۔ طب الامائل تراجم الافاضل، ص ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ شاہجہان نامہ، ج سوم، ص ۳۷۶۔ ۳۷۷۔

[1] عبرت نامہ، ص ۹۸

کے باوجود حسبِ سابق سجدہ کرتے ہیں۔ بہر حال مسجد کی تعمیر سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ لوگوں کا یہ سجدہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ دھونکل میں حضرت سخی سرور کے دربار سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خزانے میں داخل کی جاتی ہے۔

پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں درج ہے[1] کہ دھونکل ایک تاریخی مقام ہے۔ یہاں چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی میں حضرت سخی سرور تشریف لائے تھے۔ آپ کے دوران قیام یہاں ایک چشمہ جاری ہوا اور ایک حجرہ بنا کر مصروفِ عبادت ہوئے۔ یہ حجرہ شاہجہان کے عہد میں ایک دربار میں تبدیل کر دیا گیا اور چشمے کی جگہ کنواں تعمیر کر کے اسے خوبصورت بنا دیا گیا۔ آپ کے دربار پر جون۔ جولائی میں ہر سال ایک بھاری میلہ لگتا ہے۔ محکمہ اوقاف کے قیام سے پیشتر اس دربار کی آمدنی اٹھائیس کنوؤں کے مالکوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوتی تھی۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ محکمہ اوقاف نے دربار کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور اس کا انتظام نئے آئین کے مطابق کیا جاتا ہے

خلاصۃ التواریخ میں مرقوم ہے[2] کہ دھونکل میں حضرت سخی سرور کا دربار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اگرچہ یہاں مستقلاً زائرین کی آمدورفت رہتی ہے لیکن موسم گرما میں میلے کی وجہ سے لوگوں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ دور دور سے زائرین یہاں آتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ تقریباً دو مہینے تک میلے کی رونق برقرار رہتی ہے۔

آبِ کوثر میں تحریر ہے[3] کہ دھونکل میں حضرت سخی سرور کے مزار[4] پر ہر سال اساڑھ کی

---

[1] CENSUS REPORT GUJRANWALA, 1961, P1-22, 1-23.

[2] خلاصۃ التواریخ، ص ۷۳

[3] آبِ کوثر، ص ۹۲۔ نیز دیکھیں تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۷۔

[4] یہاں شیخ اکرام کو مغالطہ ہوا ہے۔ حضرت سخی سرور کا مزار دھونکل میں نہیں بلکہ ڈیرہ غازیخاں میں واقع ہے۔ یہاں تو محض آپ کا عبادت خانہ ہے جس نے دربار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسے آپ کی زیارتگاہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن مزار نہیں کہا جا سکتا۔

کی پہلی جمعرات کو ایک شاندار میلہ لگتا ہے جس میں آپ کے بہت سے عقیدت مند شرکت کرتے ہیں۔ ان عقیدتمندوں کو سلطانی کہا جاتا ہے اور یہ آپس میں پیر بھائی یا پیر بہن کہلاتے ہیں۔

عرس اور میلے میں مذکور ہے[1] کہ دھونکل میں حضرت سخی سرور کا عرس ہر سال ۲۹ اگست کو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے زائرین یہاں آتے ہیں، اور عرس کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔

۲۔ جھنڈا میلہ۔ پشاور

حضرت سخی سرور کی یاد میں دوسرا اہم میلہ پشاور میں لگتا ہے، جو جھنڈا میلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میلے کی بابت مختلف کتابوں اور سرکاری رپورٹوں میں کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذیل میں ہم باری باری چند اہم ماخذوں سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مختلف ادوار میں اس میلے کی کیا صورت تھی؟ اور پشاور میں کہاں لگتا تھا؟

منشی گوپال داس تاریخ پشاور میں لکھتے ہیں[2] کہ جھنڈا میلہ شروع میں لاہوری دروازے کے سامنے لگتا تھا لیکن بعد میں سرائے مویشی کے قریب ہونے لگا۔ یہ میلہ عام طور پر ۲۵ اکتوبر کو یا اس کے پس وپیش ہوا کرتا ہے۔ پشاور کے باشندوں کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں سے بھی بکثرت لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں۔ موصوف ذرا آگے چل کر یہ بھی بیان کرتے ہیں[3] کہ جھنڈا میلہ سال میں ایک دفعہ ماگھ کے مہینے میں دوشنبہ یعنی پیر کے دن لگتا ہے۔ اس میلے میں یہ قید ہوتی ہے کہ پیر کو بارش نہ ہو۔ میلے میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک ہوتی ہے۔ شرکا میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی ہوتے ہیں۔ میلے کا اصل نام حضرت سخی سرور کا میلہ ہے۔ لیکن عوام الناس میں اس وجہ سے کہ یہ میلہ فقیر کے نام پر ہوتا ہے اور بہت سے فقرا جھنڈے لا کر میلے کے میدان میں گاڑتے ہیں، اس کا نام جھنڈیوں کا

---

[1] عرس اور میلے، ص ۸۸

[2] تاریخ پشاور، ص ۳۵۸-۳۵۹ [3] ایضاً، ص ۳۶۱

میلہ مشہور ہوگیا۔ ابتدا میں یہ میلہ موضع ہزار جانی میں واقع اُچہ باڑہ میں ہوتا تھا، لیکن پھر ڈپٹی کمشنر کے حکم سے سرائے مویشی میں لگنے لگا، جو پشاور کی شہری آبادی سے باہر اس سڑک پر واقع ہے جو لاہور کی طرف آتی ہے۔ میلے میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ پولیس کا باقاعدہ انتظام ہوتا ہے اور مٹی کے برتن اور لکڑی کے آلات مثلاً چوکی اور چرخہ وغیرہ کی خوب تجارت ہوتی ہے۔

ضلع پشاور کے سرکاری گزیٹئر میں لکھا ہے[1] کہ یہاں کے مسلمانوں کی اصل زیارت گاہ تو مکّہ معظمہ ہے لیکن بہت کم لوگ وہاں جانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ عوام زیادہ تر ان زیارتوں پر جاتے ہیں جو ان کے علاقوں میں واقع ہیں۔ پشاور کی تین بڑی زیارتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر سالانہ عرس یا میلہ لگتا ہے۔ ان زیارتوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) جھنڈا بمقام پشاور۔ (۲) کاکا صاحب بمقام خٹک[2]۔ (۳) پیر بابا بمقام بنیر۔ پہلی دو زیارتوں پر ہر سال ایک بھاری میلہ لگتا ہے جو تین چار دن تک رہتا ہے۔ کاکا صاحب کی زیارت پر کوئی میلہ نہیں لگتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کا تصفیہ نہیں ہوسکا، تاہم یہ ایک بڑی زیارت ہے۔ موسم بہار میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی اقوام کے لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ زیارت مختلف مذاہب کا مکسچر معلوم ہوتی ہے۔ جھنڈا میلہ رمضان شروع ہونے سے پہلے ہوتا ہے۔ اس میں بھی مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی شرکت کرتے ہیں۔ میلے میں چھوٹے چھوٹے تاجر کثرت سے نظر آتے ہیں جو عارضی دکانیں لگا کر تجارتی مال فروخت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں موسیقاروں (ڈھولیوں)، ایکٹروں اور دوسرے تماشاگروں کے گروہ کے گروہ یہاں آتے اور اپنی شعبدہ بازیوں سے لوگوں خصوصاً عورتوں اور بچوں کا دل لبھاتے ہیں۔ مردوں کی دلچسپی کے لئے میلے میں کشتیوں کا انتظام ہوتا ہے۔ بڑے بڑے پہلوان شرکت کرتے ہیں۔ خوب زور آزمائیاں ہوتی ہیں۔ نیزہ بازی

---

[1] PESHAWAR GAZETTEER 1897-98, P 112-113.

[2] آج کل کاکا صاحب بمقام خٹک نہیں بلکہ بمقام زیارت کاکا صاحب واقع تحصیل نوشہرہ ہے۔ (دیکھیں:
(DISTRICT GENSUS REPORT, PESHAWAR, 1961, P 1-22

کے مظاہرے کئے جاتے ہیں۔ جسمانی کرتبوں کی نمائش ہوتی ہے۔ میلے میں پیشہ ور کھلاڑی اور طوائفیں بھی شریک ہوتی ہیں اور خوب دولت لٹوتی ہیں۔

حکومتِ برطانیہ کے تسلّط سے قبل میلے میں کوئی تنظیم یا نظم و نسق نہیں تھا۔ ہر طرف ایک بے قاعدگی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن لوگ میلے کے دنوں میں شمشیر زنی کا مقابلہ کرتے اور اس طرح اپنے جھگڑوں کو نپٹاتے تھے۔ ان کاروائیوں سے اکثر خون خرابہ ہو جاتا تھا۔ حکومتِ برطانیہ کے بعد اگرچہ پہلے جیسی بے قاعدگی تو نہیں رہی تاہم میلے کے دنوں میں چار پانچ قتل ضرور ہو جاتے ہیں۔

جھنڈا میلہ حضرت سخی سرور کا یوم وفات منانے کے لئے پشاور میں لگتا ہے۔ چونکہ اس کے انعقاد میں سوموار کی تخصیص ہوتی ہے اس لئے بارش کے سبب اسے ملتوی بھی کر دیا جاتا ہے۔ اگر حکومت لوگوں کے اژدحام پر پابندی کو ضروری سمجھتی ہو تو مصلحتاً میلے کو روک بھی دیا جاتا ہے۔

پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں بھی اسی قسم کا اندراج ہے[1] کہ پشاور کی تین بڑی زیارتیں ہیں جن پر ہر سال ایک بھاری میلہ یا عرس ہوتا ہے۔ (اوّل) جھنڈا بمقام پشاور۔ (دوم) کاکا صاحب بمقام تحصیل نوشہرہ۔ (سوم) پیر بابا واقع بنیر۔ جھنڈا میلہ، بیاد حضرت سخی سرور، رمضان سے ذرا پہلے لگتا ہے۔ میلے میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ بہت سے گویئے اپنے ناچ گانوں سے لوگوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ مٹھائیوں اور کھلونوں کا کاروبار خوب ہوتا ہے۔ بعض جوئے باز میلے میں جُوا بھی کھیلتے ہیں۔

ارمان سرحدی نے اپنی کتاب "عرس اور میلے" میں جھنڈا میلہ کا غالباً آنکھوں دیکھا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[2] کہ پشاور کے مشہور شاہی باغ[3] میں ہر جنوری کی آخری پیر

ف[1] DISTRICT CENSUS RERORT, PESHAWAR, P 1-22.

ف[2] عرس اور میلے، ص ۲۸۰-۲۸۲

ف[3] پہلے یہ میلہ پشاور شہر کے ریلوے اسٹیشن کے قریب لکڑی گودام میں لگتا تھا۔ آج کل شاہی باغ میں منعقد ہوتا ہے جو شہر سے قدرے فاصلے پر بیرونی حصے میں واقع ہے۔ (عرس اور میلے، ص ۲۸۰)

کو جھنڈوں کا میلہ لگتا ہے۔ چونکہ ان ایام میں بارشش کا موسم ہوتا ہے اس لئے اگر مقررہ پیر کو بارش ہو جائے تو یہ میلہ آئندہ پیر کو لگتا ہے۔ جھنڈوں کے میلے کو حضرت سخی سرور کا میلہ بھی کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ ۱ میلے کے نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ بہت سے قلندر اور درویش اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگے جھنڈے ہوتے ہیں۔ ان جھنڈوں کو وہ میلے کے میدان میں مختلف جگہوں پر گاڑ دیتے ہیں اور لوگوں سے نیاز طلب کرتے ہیں۔ انہی جھنڈوں کی نسبت سے اس میلے کو جھنڈا میلہ کہتے ہیں۔ یہ ضلع پشاور کا واحد عوامی میلہ ہے جو گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ اپنی رونق، چہل پہل کے لحاظ سے یہ میلہ عیدین کے میلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ چونکہ یہ میلہ سردی کے اختتام اور بہار کی آمد پر منایا جاتا ہے اس لئے اس کو موسمی میلہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ قدموں کا میلہ۔ لاہور

دھونکل اور پشاور کی طرح لاہور میں بھی حضرت سخی سرور کی یاد میں میلے لگتے ہیں، جن میں بکثرت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ ایک کو قدموں کا میلہ اور دوسرے کو پار کا میلہ کہتے ہیں۔ آخر الذکر کا حال تو آگے بیان کیا جائے گا یہاں اوّل الذکر کی بابت کچھ تفصیلات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ دھونکل اور پشاور کے میلے کی طرح قدموں کے میلے کے متعلق بھی بہت سے ماخذوں سے گرانقدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیل میں بعض اہم ماخذوں کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ یہ میلہ وقتاً فوقتاً کہاں، کیسے اور کیوں لگتا رہا ہے اور بتدریج لاہور کے جغرافیائی حالات میں کیا سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔

ضلع لاہور کے سرکاری گزیٹئر میں مرقوم ہے[۱] کہ قدموں کا میلہ، مسجد سخی سرور، واقع انارکلی بازار پر ہر سال فروری کے مہینے میں لگتا ہے۔ حضرت سخی سرور پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے

---

۱ REVISED GAZETTEER OF LAHORE DISTRICT, 1893-94, P-79.

ایک بڑے بزرگ تھے۔ ان کے حالات رپورٹ مردم شماری ۱۸۹۱ء میں درج[1] کئے جا چکے ہیں۔ آپ کا زمانۂ حیات چھٹی صدی ہجری مطابق بارھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کی تمام زیارتوں کے محافظ مسلمان اور بھرائی قوم کے افراد ہیں۔ آپ کے مریدوں یا عقیدت مندوں کو سلطانی کہا جاتا ہے۔ وہ ہر مذہب اور قوم میں نظر آتے ہیں۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سخی سرور چھوٹے چھوٹے بچوں کے مربی اعظم تھے۔ میلے کے موقع پر اکثر بچے آپ کی زیارت گاہ واقع لاہو پر پیش کئے جاتے ہیں۔ بڑا ہی دلچسپ ناچ گانا ہوتا ہے۔ میلہ کوئی تین دن تک رہتا ہے اور اس میں پانچ چھ ہزار کے لگ بھگ آدمی شریک ہوتے ہیں۔

پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں بھی اسی قسم کا اندراج ہے۔ اس میں مذکور رہے[2] کہ قدموں کا میلہ دہلی، لوہاری اور شاہ عالمی دروازوں کے باہر ماہ فروری میں لگتا ہے۔ ابٹ سن اور ایڈورڈ مکلیگن کا بیان ہے[3] کہ یہ میلہ جو عرفِ عام میں قدموں کا میلہ کہلاتا ہے، حضرت سخی سرور کی زیارت گاہ واقع انارکلی نزد تھانہ پر منعقد ہوتا ہے۔ عام طور پر فروری کے مہینے میں چاند کے بعد پہلی پیر کو منایا جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے شریک ہوتے ہیں اور اپنی منتوں کے چڑھاوے آپ کی زیارت گاہ پر چڑھاتے ہیں۔ پیشہ ور موسیقار اور گوّیے جن کو ڈھولی کہا جاتا ہے ان بچوں کو، جو آپ کی زیارت گاہ کے سامنے لائے جاتے ہیں گود میں لے کر ناچتے اور گاتے ہیں۔

مولوی نور احمد نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں "احوال مکان چوکی سخی سرور" کے ذیل میں

۱؎ CENSUS REPORT, 1891, P 132-137 ؛ نیز دیکھیں: GLOSSARY, VOL 1, P566-73.
PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P132-138. اور، کتاب ہذا،

۲؎ DISTRICT CENSUS REPORT LAHORE, 1961, P 1-24. ۔ نیز دیکھیں:
LAHORT GEZETTEER, 1916, P 84.

۳؎ GLOSSARY, VOL 1, P 570. ، PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135.

لکھا ہے[1] کہ یہ مقام صدر بازار انار کلی کی سرائے محمد شفیع کے جنوب رویہ موجود ہے۔ اس راہ کے غرب رویہ مکانات خام واقع ہیں۔ یہ مکان بشکل کوٹھہ قالبوتی خشتی و پختہ بنا ہوا ہے جس کا دروازہ مشرق رویہ چوبی ہے۔ اندر اور باہر کی استرکاری پرانی وضع کی ہے۔ سنگ استرکاری کبھی سفید تھا لیکن اب سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس کوٹھہ کے اندر مغربی دیوار میں ایک طاقچہ بڑا اور دو طاقچے چھوٹے ہیں۔ بڑے چراغدان کے اوپر محرابی طاقچہ بنا ہوا ہے۔ یہ مکان حضرت سخی سرور کے نام پر آپ کے عقیدت مندوں نے جن کو بھرائی کہتے ہیں، بطمع نفسانی بنایا ہوا ہے، ورنہ آپ کے اعتکاف کا یہ کوئی اصلی مکان نہیں ہے۔ اس جگہ پر حضرت سخی سرور کے قدموں کا میلہ ماہِ پھاگن کے نوچندہ منگل کو ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ میلہ تھانہ انار کلی کے متصل نواب وزیر خاں کے باغ میں ہوتا تھا، جہاں کھجوروں کے علاوہ بیروں کے بھی چند ایک قدیم درخت تھے۔ اس واسطے اس میلے کا نام بڈھی بیری کے قدم مشہور تھا۔ بعد ازاں سمت ۱۸۸۰ میں یہ مکان بخرچ چندہ چھ بھرائی افراد نے بنوایا جن کے نام یہ بتائے جاتے ہیں: نہال، دودا، خواجہ، جمیتا، نتھو، وزیر[2]

مولوی نور احمد نے ذرا آگے چل کر یہ بھی بیان کیا ہے[3] کہ جس روز قدموں کا میلہ لگتا ہے اس روز شیطان کا بازار خوب گرم ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور فاحشہ عورتیں بھی کثرت سے میلے میں شریک ہوتی ہیں۔ لوہاری دروازے سے لے کر تھانہ انار کلی تک ہزاروں آدمی نظر آتے ہیں۔ سینکڑوں بھرائی جن کو ڈھولی کہتے ہیں، اِدھر اُدھر ڈھول بجاتے پھرتے ہیں۔ لوگ ان سے پھمنیاں ڈلواتے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ بھرائی بچوں کو گود میں لے کر ناچتے گاتے ہیں اور اکثر ایسی لوریاں سناتے ہیں:

سرور دے دربار مراداں لے آئی ہاں

---

[1] تحقیقاتِ چشتی، ص ۴۹۳-۴۹۴
[2] تحقیقاتِ چشتی کی تالیف تک یہی چھ آدمی اس مکان کے مالک متصور کئے جاتے تھے۔
[3] تحقیقاتِ چشتی، ص ۴۹۵

دے مراداں سرور پیرا   مینو تیرے در دا وہیرا
گودی بال کھڈا مراداں لے آئی ہاں

جن لوگوں کے بچوں کو گود میں لے کر بھرائی پھمنیاں ڈلتے ہیں، وہ کچھ زر نقد اور غلہ وغیرہ ان کو دیتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں نچلے طبقے کے لوگ حضرت سخی سرور کو بہت مانتے ہیں۔ آپ درحقیقت ایک بڑے بزرگ اور سیّد کامل تھے لیکن بھرائیوں نے آپ کا نام بگاڑ رکھا ہے۔ آپ کا مزار بمقام نگاہہ (سخی سرور) واقع ہے اور عرس کے موقع پر لکھوکھا آدمی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ کالی کمبلی کا ایک قافلہ دوآبہ سے ادھر کا رخ کرتا ہے۔ اس میں ہزارہا مرد و زن شامل ہوتے ہیں جن پر اکثر کالی لوئیاں ہوتی ہیں۔ یہ قافلہ ایک روز لاہور میں ٹھہر کر نگاہہ کی سمت روانہ ہو جاتا ہے، جو ملتان سے کوئی ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

نقوش لاہور نمبر میں "قدموں کا میلہ" کے ذیل میں مرقوم ہے[1] ـــــ آپ کے روضہ مبارک کے مجاوروں میں سے ایک بزرگ حضرت سیّد زین العابدین، سلطان ناصر الدین محمود بن شمس الدین التتمش کے زمانے میں پاک وہند آئے اور ملتان سے تیرہ میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب، قصبہ شاہکوٹ میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں ان کے ہاں دو فرزند پیدا ہوئے۔ جن میں چھوٹے کا نام سیّدی احمد تھا[2]۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ علم حاصل کرنے کے لئے لاہور پہنچے اور ایک عرصہ تک یہاں کے علما و صلحا کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا۔ ان کی بخشش و سخاوت کی بنا پر لوگ انھیں سخی سرور اور لکھ داتا کہتے ہیں۔ لاہور سے نکل کر سیر و سیاحت کے شوق میں شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرے حتیٰ کہ پاک وہند سے باہر بغداد تک پہنچے۔ وزیرآباد کے قصبہ دھونکل میں ان سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ یہاں آپ کی یادگار ایک مسجد، چشمہ اور تالاب اب تک قائم ہے۔ آپ کا

---

[1] نقوش لاہور نمبر، ص ۷۷۴۔

[2] حضرت سخی سرور چھوٹے نہیں بلکہ بڑے صاحبزادے تھے اور آپ کا نام سیّد احمد سلطان تھا سیّدی احمد نہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی سیّد عبد الغنی المعروف خان ڈھوڈا تھے۔

مزار ڈیرہ غازی خاں سے بجانب کوہِ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ یہ جگہ آپ ہی کے نام پر سخی سرور کہلاتی ہے۔ اس کے قریب ہی درہ سخی سرور ہے جو کبھی قندھار اور ڈیرہ غازیخاں کے درمیان ایک تجارتی ذریعہ تھا۔

قدموں کا میلہ انہی بزرگ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ میلے کے اصلی دن چار ہیں یعنی ۱۰ اپریل سے ۱۳ اپریل تک۔ لیکن آپ کے عقیدت مندوں کے گروہ جن کو سنگ کہتے ہیں فروری مارچ ہی میں بوریا بستر باندھ کر سفر کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، جھنگ، لائل پور اور دیگر اضلاع سے دھونکل اور وہاں سے لاہور آتے ہیں۔ یہاں ان کے آستانے[۱] سے لے کر پرانی انارکلی تک میلہ لگتا ہے اور خوب دھوم دھام ہوتی ہے۔ ڈھول بجانے والوں کو عرفِ عام میں شیخ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ آپ کے آستانے پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتے اور گاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ حضرت سخی سرور کو ننھے منّے معصوم بچوں سے بڑی محبت تھی اور وہ ان کے مربّی مانے جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے بچوں کو میلے میں لاتی ہیں اور شیخ ان کو گود میں اٹھا کر بڑے عجیب انداز سے ناچتے ہیں۔ ناچ کے دوران کچھ اس قسم کی لوریاں گاتے رہتے ہیں:

لوری لال نوں دیواں   نکے بال نوں دیواں

لال وے لے لے لوری

حضرت سخی سرور کی درگاہ کے علاوہ یہ میلہ موری اور دہلی دروازوں کے باہر بھی لگتا ہے۔ جہاں یہی شیخ بچوں کو گود میں لئے ناچتے گاتے رہتے ہیں۔ میلے کے دنوں میں حلوائیوں اور کھلونوں کی دکانیں خوب سجائی جاتی ہیں۔ بعض جگہوں پر جھولے ڈلے جاتے ہیں جن میں بچے بڑے شوق سے جھولتے ہیں۔ میلے کی بڑی سوغات تیل کے قتلے اور مٹی کے برتن ہیں۔ پہلے اس میلے میں بڑی رونق ہوتی تھی لیکن گذشتہ چند سالوں سے اس میں خاصی کمی آگئی ہے۔

---

[۱] سید محمد لطیف نے لکھا ہے کہ حضرت سخی سرور کا مزار لاہور میں واقع ہے لیکن یہ درست نہیں۔ (دیکھیں: نقوش لاہور نمبر، ص ۷۶۴ بحوالہ (HISTORY OF LAHORE.

ہم نے اوپر تقریباً تمام ماخذوں سے ضروری اندراجات نقل کر دیئے ہیں۔ ان سے قدموں کے میلے کی بابت خاصی پرمغز معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ایک بات جو مذکورہ بالا اقتباسات میں کسی قدر اختلاف سے بیان ہوئی ہے وہ میلے کی صحیح تاریخ ہے۔ کسی نے بیان کیا ہے کہ میلہ فروری میں لگتا ہے اور کسی نے کہا ہے کہ اپریل میں ہوتا ہے۔

۴۔ پار کا میلہ۔ لاہور

قدموں کے میلے کی طرح پار کا میلہ بھی حضرت سخی سرور کے نام پر لاہور میں لگتا ہے بعض کتابوں سے اس میلے کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ شیخ اکرام کا بیان ہے[۱] کہ حضرت سخی سرورؒ کے عقیدت مند جب قافلہ در قافلہ دھونکل کا رُخ کرتے ہیں تو لاہور میں دریائے راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر میں بھی ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک بڑا میلہ لگتا ہے جو عوام میں "میلہ پار" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ میلہ تقریباً دو تین دن تک رہتا ہے اور ہزاروں لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں۔

لاہور نقوش نمبر میں بھی اس میلے کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اس میں یہ مذکور نہیں کہ یہ میلہ کیوں اور کس بزرگ کی یاد میں لگتا ہے؟ تاہم اس سلسلے میں شیخ اکرام کا بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہمیں یہ مان لینے میں تامّل نہیں ہونا چاہیے کہ یہ میلہ ان زائرین کے اجتماع کی وجہ سے لگتا ہے جو حضرت سخی سرور کے دربار واقع دھونکل کی زیارت کو جاتے ہیں۔

نقوش لاہور نمبر میں "پار کا میلہ" کے عنوان سے مرقوم ہے[۲] کہ یہ میلہ دریائے راوی کے اس طرف مغل شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ میں لگتا ہے۔ اسی نسبت سے اس کو پار کا میلہ کہتے ہیں۔[۳]

---

[۱] آبِ کوثر، ص ۹۲۔ نیز دیکھیں، تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۳۲۷

[۲] نقوش لاہور نمبر، ص ۷۶۵۔

[۳] اس میلے کو پار کا میلہ کہنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے یو۔پی اور مشرقی پنجاب

قیام پاکستان سے پہلے جب ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی نہیں تھی، یہ میلہ بھی میلہ چراغاں کی طرح بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ رات چراغوں کی روشنی سے مقبرۂ جہانگیر بقعۂ نور نظر آتا تھا۔ لوگ تمام دن مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رنگ رلیاں مناتے۔ رات کو رت جگا ہوتا۔ قسم قسم کے پکوان پکتے۔ کھیل تماشوں میں کشتیاں ہوتیں۔ کبڈیوں کے مقابلے ہوتے۔ بھانڈ اور بازی گر اپنے اپنے کرتب اور شعبدے دکھاتے۔ پاک و ہند کی مشہور طوائفوں کے مجرے ہوتے۔ غرض میلے میں بڑی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی۔

کچھ عرصے بعد لاہور کے خوش باش لوگوں نے میلے میں ایک عجیب جدت پیدا کی۔ شاہدرے میں کوٹھے کرایہ پر لئے جاتے۔ ساری رات جوا کھیلا جاتا جس میں ہزاروں روپوں کی ہار جیت ہوتی۔ رفتہ رفتہ یہ وبا مقبرہ جہانگیر میں بھی آدھمکی۔ یہاں بھی خوب جوئے بازی ہوتی، حتیٰ کہ مقبرے کے مینار بھی اس بدعت اور لعنت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے ان جھڑپوں میں ایک مرتبہ ایک پولیس والے کو مینار سے دھکا دے کر گرا دیا گیا۔ وہ جاں بحق ہو گیا۔ آخر حکومت کو اس طرف توجہ دینی پڑی اور جوئے بازی پر کڑی نگرانی کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس میلے میں وہ دھوم دھام نہیں رہی جو آج سے کوئی تیس سال قبل تھی۔

۵۔ سالانہ عرس۔ ڈیرہ غازی خاں

زیارت سخی سرور کے عنوان سے ہم نے کتاب ہٰذا میں لکھا ہے[1] کہ حضرت سخی سرور کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی مختلف ٹولیاں ہر سال آپ کے سالانہ عرس میں شرکت

کے سلطانی جب دھونکل کو روانہ ہوتے تو انھیں دریائے راوی کو پار کرنا ہوتا ہے۔ یہ سلطانی مختلف ٹولیوں میں لاہور آتے تھے اور یہاں مقبرہ جہانگیر میں کچھ دن ٹھہر کر قافلے کی صورت میں دھونکل کی سمت جاتے تھے۔ اسی دوران قیام میں پار کا میلہ لگتا تھا۔

کرنے کی غرض سے ڈیرہ غازیخاں کا رخ کرتی ہیں۔ یہ ٹولیاں سنگ کہلاتی ہیں۔ آپ کی یاد میں جو عرس ڈیرہ غازیخاں میں منایا جاتا ہے۔ اس کی مثال بہت کم بزرگوں کے سالانہ عرسوں میں نظر آتی ہے۔ عرس کے دنوں میں آپ کے مزار پر خلائق کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے دور دراز علاقوں سے آپ کے عقیدت مند، جو عرف عام میں سلطانی کہلاتے ہیں۔ جوق در جوق عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس عرس کا ذکر مختلف کتابوں اور سرکاری گزیٹیرز میں ملتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں عرس کی کیا کیفیت تھی۔ ذیل میں قارئین کے استفادہ کے لئے ان ماخذوں سے کچھ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

منشی حکم چند تواریخ ضلع ڈیرہ غازیخاں میں ذکر میلہ کے عنوان سے لکھتے ہیں[۱] کہ حضرت سخی سرور ایک ایسے بزرگ ہیں جن کو برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اور ہندو دونوں مانتے ہیں۔ زیادہ تر ان قوموں کے زمیندار آپ کے معتقد ہیں۔ جالندھر، ہوشیارپور، گورداسپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ گجرات، ساہیوال (منٹگمری)، ملتان، مظفرگڑھ اور لاہور وغیرہ کے اضلاع میں آپ کی بڑی مانتا ہوتی ہے۔ جزوی طور پر لدھیانہ، انبالہ اور امرتسر کے لوگ بھی آپ سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ پنجاب کے اکثر دیہات میں آپ کے نام پر ایک مربعہ عمارت بنی ہوئی ہے جو پختہ یا خام ہے۔ جمعرات کی شام کو اس عمارت میں چراغ جلایا جاتا ہے اور نذر نیاز کی جاتی ہے۔

اضلاع بالا سے پھاگن اور چیت کے مہینے میں لوگ روزانہ گروہ در گروہ مزار مبارک کی زیارت کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اور بیساکھی کے دن یعنی تقریباً گیارہ اپریل کو یہاں ہر سال ایک بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ میلے میں یوں برصغیر کے مختلف اضلاع کے لوگ شرکت کرتے ہیں، لیکن ملتان، مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے باشندوں کی کثرت ہوتی ہے۔ میلے میں ڈھول تاشے اور نقارے وغیرہ پیٹے جاتے ہیں۔ پہاڑی لوگ کچھ مویشی یعنی بھیڑ بکریاں، گھوڑے گدھے اور دوسری اشیائ مثلاً ٹاٹ، بوریا اور غلہ وغیرہ بغرض تجارت یہاں لاکر فروخت کرتے ہیں[۲]

---

[۱] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خان، ص ۴۴ - ۴۵

[۲] کہا جاتا ہے کہ کپتان سنڈمن نے، جو ایک وقت میں ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے ہیں، انعام اسپان کا جلسہ

طوائفوں کے ناچ گانے اور مجرے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی اور تماشے بھی ہوتے ہیں۔

ڈیرہ غازیخاں اور سخی سرور کے درمیان ایک موضع ہے جس کو وڈور کہتے ہیں۔ اس موضع میں حضرت سخی سرور کے چھوٹے بھائی سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا کے نام پر ایک زیارتگاہ بنی ہوئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے جو لوگ حضرت سخی سرور کے سالانہ عرس میں شریک ہوتے ہیں، وہ پہلے خان ڈھوڈا کی زیارت کو سلام کرتے ہیں اس کے بعد مزار اقدس پر حاضر ہوتے ہیں۔ موضع سخی سرور کی مالیات بنام درگاہ معاف ہیں محکمہ اوقاف کی تاسیس سے قبل درگاہ کے مجاور مالیات کی اس معافی سے استفادہ کرتے تھے۔

پاک و ہند کے اکثر ہندو حضرت سخی سرور کے مزار پر حاضر ہو کر اپنے بچوں کی زنار بندی کرتے اور جھنڈا اترواتے تھے۔ بعض مسلمان بھی اپنے بچوں کے بال یہاں کٹواتے ہیں۔ دونوں اقوام کا یہ عمل ان کے مذہب کے خلاف ہے۔ لیکن عہد قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے۔ دیوان ساون مل نے، جو سکھوں کے عہدِ حکومت میں ملتان کا گورنر تھا، ہندوؤں کو زنار بندی کی رسم ادا کرنے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر اس نے ہر ہندو سے سوا روپیہ[1] ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔ اس پر بھی ہندوؤں نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی

بھی حضرت سخی سرور کے زمانے میں منعقد کیا تھا۔ اور ولایتی پارچہ جات وغیرہ یہاں فروخت کرائے تھے۔ مذکورہ کپتان اس میلے کے حق میں تھے اور اس کو زیادہ سے زیادہ پُر رونق بنانا چاہتے تھے۔ (دیکھیں تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۵)

[1] بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ دیوان ساون مل ایک متعصب ہندو تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی قوم کے لوگ ایک مسلمان بزرگ کے مزار کی زیارت کے لئے اس کثرت سے جائیں۔ چنانچہ اس نے ہندوؤں کی اس یاترا کو بند کرنے کے لئے سوا روپیہ فی کس جرمانہ کیا لیکن اس پر بھی ہندو باز نہ آئے اور برابر زیارت کو جاتے رہے۔ (دیکھیں آبِ کوثر، ص ۹۴، چشمۂ کوثر ص ۸۳) ہمارے خیال میں شیخ اکرام کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ منشی حکم چند نے دیوان ساون مل

نہیں کی۔ وہ سوا روپیہ ٹیکس دے کر بدستور حضرت سخی سرور کے مزارِ مقدس کی زیارت کرتے رہے۔ تقسیم ہند تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں کسی قدر کمی آگئی۔

منشی حکم چند کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے[1] کہ کسی زمانے میں یہاں پانی کی بڑی قلت تھی۔ مزارِ مبارک کے آس پاس کوئی کنواں وغیرہ نہیں تھا۔ نے لگی، یعنی وہ نہر جو خانقاہ کے قریب واقع اکثر خشک رہتی تھی۔ جب بارش ہوتی اور پہاڑی نالہ بہتا ہوا نے لگی میں داخل ہوتا تو لوگ اس برساتی پانی کو اپنے مصرف میں لاتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں پانی کی کمی کے باعث بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ خانقاہ کے قرب و جوار میں کوئی تین چار کوس کے فاصلے پر ایک چشمہ ہے، لوگ خصوصاً مجاور، اونٹوں، بیلوں اور گدھوں پر یہاں سے پانی لاد کر میلے میں فروخت کرتے تھے۔ ایک ایک کٹورا چار آنے سے آٹھ آنے تک فروخت کرتے تھے۔ مجاوروں کو پانی کی تجارت سے خاصا مالی فائدہ بہم پہنچتا تھا۔ آخر کپتان سڈمن، ڈپٹی کمشنر نے یہاں ایک کنواں کھدوا کر پانی کی قلت کو رفع کر دیا۔

منشی حکم چند نے یہ بھی لکھا ہے[2] کہ ڈیرہ غازی خاں اور اس کے آس پاس بسنے والے ہندو اپنے مردوں کے پھول گنگا میں بہانے کی بجائے نے لگی میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نے لگی بھی گنگا اور جمنا کی طرح پوتر اور پاک ہے۔ موضع سخی سرور کے باشندے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، سب کے سب جب سوتے ہیں تو زمین پر سوتے ہیں۔ کسی کے گھر کوئی پلنگ یا چارپائی نہیں ہے۔ پورے موضع میں صرف ایک مسہری ہے جو اسوقت استعمال کی جاتی ہے جب کوئی مر جاتا ہے۔ اس کی نعش کو اس مسہری پر اٹھا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔

کی متعصبانہ حرکت کو مذہب کی آڑ لے کر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ منشی حکم چند خود ہندو تھے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی قوم کے افراد ایک مسلمان بزرگ سے عقیدت کا اظہار کریں اور دیوان ساون مل پر خواہ مخواہ تنگ نظری کا داغ لگے۔

[1] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۵۔

[2] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۵۔

دربار سخی سرور کے چڑھاووں اور نذرانوں کی آمدنی سے مجاور ان لوگوں کو جن میں بعض مریض خصوصاً جزامی بھی شامل ہوتے ہیں، روٹی کپڑا دیتے ہیں۔ عرس کے ایام میں یہاں دو دیگیں چڑھائی جاتی ہیں۔ ایک کو دیگ مانگی یا دیگ کلاں اور دوسری کو دیگ منگر کہتے ہیں۔ ان دیگوں میں گڑ، روغن، گیہوں کا دلیہ اور میوہ وغیرہ ملا جلا کر پکایا جاتا ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے۔ لوگ تبرکاً ان دیگوں سے کچھ نہ کچھ اپنے لئے وصول کرتے ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں کے سرکاری گزیٹیئر میں تحریر ہے[1] کہ یہاں ہر سال مختلف عرس اور میلے لگتے ہیں۔ ان کی تاریخوں میں ہر سال کوئی نہ کوئی فرق ضرور ہوتا ہے۔ تاہم حضرت سخی سرور کے مزار پر جو سالانہ عرس ہوتا ہے اس کی مدت تخمیناً گیارہ اپریل سے سولہ اپریل تک رہتی ہے۔

پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں مذکور ہے[2] کہ ڈیرہ غازیخاں کے میلوں میں کئی ایک قابل ذکر ہیں۔ عید الفطر، عید الاضحیٰ۔ محرم۔ میلہ مویشیاں۔ میلہ بمقام سخی سرور، جو عرس کے دنوں میں ہوتا ہے۔ آخر الذکر میلے میں یعنی حضرت سخی سرور کے سالانہ عرس کے موقع پر وافر تعداد میں مویشی لاکر فروخت کئے جاتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کی مختلف جماعتیں جلوس کی شکل میں یہاں آتی ہیں۔ یہ جماعتیں سنگ کہلاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد کے ہاتھوں میں سبز رنگ کے جھنڈے ہوتے ہیں۔ لوگ باگ ناچتے گاتے، خراماں خراماں سخی سرور کی طرف بڑھتے ہیں۔ گو ڈیرہ غازی خاں میں بعض دوسرے علاقوں بالخصوص کوٹ مٹھن اور تونسہ پر بھی ہر سال بھاری میلے یا عرس ہوتے ہیں لیکن حضرت سخی سرور کے سالانہ عرس کی جو شان اور رونق ہے اس کا جواب نہیں۔

آخر میں ہم ایم میکالف[3] کے ایک مضمون بعنوان میلہ بمقام سخی سرور سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ اس مضمون میں موصوف نے چشم دید واقعات کا ذکر کیا ہے اس سے جہاں

ف۱ GAZETTEER DERAGHAZI KHAN (REVISED EDITION) 1893-97, P48.

ف۲ DISTRICT CENSUS REPORT. D. G. KHAN, 1961, P 1-20.

ف۳ M. MACAULIFFE.

بعض جزوی تفصیلات کا پتا چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر ملکی اور غیر مسلم کا اس عرس یا میلے کے متعلق کیا نظریہ تھا۔ امید ہے قارئین کے لئے حضرت سخی سرور کے سالانہ عرس سے متعلق ایک انگریز کا بیان کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ایم میکالف لکھتے ہیں[1] کہ موضع سخی سرور پنجاب کے ایک بڑے ضلع ڈیرہ غازیخاں کے مغرب میں کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ یہ موضع ایک مسلمان بزرگ کے نام پر مشہور ہے جن کی خانقاہ پر ہر سال ایک بھاری عرس لگتا ہے۔ اس کے بعد حضرت سخی سرور کے کچھ حالات قلمبند کئے گئے ہیں جن کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ حضرت سخی سرور کے سالِ وفات پر شدید اختلاف ہے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ آپ نے ۶۵۰ھ مطابق ۱۲۵۲ء میں وفات پائی ہے۔[2] آپ کی موجودہ خانقاہ دو ہندو بھائیوں نے بنوائی تھی جو لاہور کے متمول تاجروں میں سے تھے اور ایک وقت میں پنجاب کے وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے نام دیوان جسپت رائے اور دیوان لکھپت رائے ہیں۔[3] لاہور میں کوٹ لکھپت کا علاقہ مؤخر الذکر کے نام پر ہی مشہور ہے۔ اگرچہ خانقاہ کے بنوانے والے ہندو ہیں لیکن اس میں جو بزرگ مدفون ہیں، وہ مسلمان ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اور ہندو یکساں طور پر مزاروں کی قدر کرتے اور ان پر نذرانے چڑھاتے ہیں۔

خانقاہ پر یوں تو برصغیر پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے زائرین کی آمد کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے لیکن عرس کی وجہ سے ان کی مختلف جماعتیں فروری میں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور میلہ بیساکھی یعنی تقریباً ۱۲ اپریل تک آتی رہتی ہیں۔ پاک و ہند میں یہ وقت میلے ٹھیلوں

۱ے CALCUTTA REVIEW, VOL LX (60), 1875, P78-79.

۳ے دیوان جسپت رائے اور دیوان لکھپت رائے کا کچھ حال کنہیا لال نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ لاہور، ص ۳۴۴-۳۴۵۔

کے لئے بہت موزوں ہے۔ حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر جو میلہ لگتا ہے اس کے باقاعدہ طور پر شروع ہونے سے تقریباً ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ قبل عقیدت مندوں کے گروہ کے گروہ ڈیرہ غازی خاں کا رُخ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہر قماش کے آدمی ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ٹٹوؤں سے لے کر اعلیٰ نسل کے گھوڑوں تک مختلف قسم کے مویشی ہوتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، ہندو، مسلمان، سکھ سبھی لوگ اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ بہت سے فقیر اور درویش جن کے لمبے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہوتے ہیں تہہ بند اور دھوتیاں باندھے قطار اندر قطار چلے آتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہ لوگ نعرے مارتے جاتے ہیں۔ ہندو تاجر روپیہ کمانے کی غرض سے اپنی دکانوں کا اسباب اٹھائے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مداری اپنا ساز و سامان یعنی بندر اور ریچھ وغیرہ لے کر یہاں آتے ہیں۔

ایم میکالف کہتے ہیں[1] کہ گیارہ اپریل کو، جس کے دوسرے دن یعنی بارہ اپریل کو میلہ اپنے شباب کو پہنچنے والا تھا، میں ڈیرہ غازی خاں سے سوار ہو کر "سخی سرور" کی طرف روانہ ہوا۔ ڈیرہ سے سخی سرور تک کا فاصلہ کوئی تیس میل کے لگ بھگ تھا۔ چلتے چلتے میں وڈور کے مقام پر پہنچا، جو ڈیرہ غازیخاں اور سخی سرور کے درمیان واقع ہے۔ یہاں پر میں سڑک سے ہٹ کر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ ابھی تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ چند ایک مقامی گھوڑ سواروں سے جا ملا۔ ہم سب چلتے چلتے ایک تالاب کے پاس آئے۔ یہاں ایک فقیر رہتا تھا۔ اس کے کپڑے ڈھیلے ڈھالے اور میلے کچیلے تھے۔ سر پر عجیب و غریب قسم کی ٹوپی تھی جس سے اس کی وضع قطع خاصی بدنما نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہم کو دیکھا تو پہلے مجھے صاحب انگریز کہہ کر سلوٹ مارا پھر میرے ہمراہیوں کو عام انداز میں السلام علیکم کہا۔ اس نے ہمیں پانی پلایا اور حقے پر مدعو کیا۔ میرے ساتھی تو حقہ پینے لگے لیکن میں آگے بڑھ گیا۔

---

[1] CALCUTTA REVIEW, P 80-81.

چند میل چلا تھا کہ سخی سرور کی سفید عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ حضرت سخی سرور کے چار یاروں میں سے دو کے مقبرے بھی نظر آنے لگے جو ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ سخی سرور کے ذرا اور قریب پہنچا تو خانقاہ کی مسجد کے میناروں پر نظر پڑی جو انگلستان کے چرچ سے مشابہ تھے۔ پھر میں جلد ہی ایک جگہ سے گزرا جس کو مقامی لوگ نی لگی کہتے ہیں۔ یہ نی خانقاہ کے بالکل قریب سے گزرتی ہے اور اس کے اندر سے چالیس سیڑھیاں خانقاہ کی طرف اوپر کو چڑھتی ہیں۔ ان سیڑھیوں پر چمکدار مسالہ لگایا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں جب ان سیڑھیوں پر پڑ کر منعکس ہوتی ہیں تو تمام وادی جگمگاتے لگتی ہے۔ اس جگہ خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ میں مجمع کو چیرتا ہوا اس سرائے تک پہنچا جو انگریزوں کے لئے مخصوص تھی۔ یہ مکان جہاں میں نے قیام کیا، کچا پکا تھا۔ اس کی دیواروں پر بڑا ہی کھردرا پلستر کیا گیا تھا۔ چھت پر توڑی وغیرہ پڑی ہوئی تھی۔ کوئی فرنیچر یہاں موجود نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجاوروں کو یا تو نئے سامان نشست سے آگاہی نہیں تھی اور یا وہ صرف قالین کو بچھا دینا ہی کافی سمجھتے تھے۔ دن بڑا گرم تھا۔ گرمی اور تمازت کے سبب سر چھپانے کی ہر جگہ اس وقت مجھے بھلی لگی۔ مجھے ایک قالین پر بٹھادیا گیا بالکل اسی طرح ملکہ زماں کے مرحوم گورنر جنرل لارڈ لارنس کو بھی بٹھایا گیا تھا جب کہ وہ پنجاب کے چیف کمشنر کی حیثیت میں یہاں تشریف لائے تھے[۱]

یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے نوکر، جن کو میں نے اپنے قبل ادھر روانہ کیا تھا، ابھی تک نہیں پہنچے۔ خیال ہوا کہ شاید گزشتہ رات کی بارش اور تاریکی میں وہ راستہ بھول گئے ہیں۔ چنانچہ میں اپنا کھانا خود تیار نہ کروا سکا اور اس سلسلے میں مجھے خانقاہ کے مجاوروں کی پیش کش قبول کرنی پڑی۔ کھانے کی تیاری کے دوران میں نے مجاوروں سے درخواست کی کہ مجھے خانقاہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس پر انھوں نے خانقاہ کے ریکارڈ مجھے دکھائے جو فارسی اشعار میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ بہت مختصر سا مجموعہ تھا۔ اس

---

۱ دیکھیں: ANNALS, P, 81-82 (CALCUTTA REVIEW

کا کاغذ قدیم اور بوسیدہ تھا۔ میں نے اس مجموعے میں سے حضرت سخی سرور کے متعلق ضروری معلومات اخذ کر لیں۔ ابھی میں اس کام میں مصروف تھا کہ خالص مشرقی طرز کا کھانا میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس میں روٹی، ابلے ہوئے چاول، کری اور دودھ وغیرہ شامل تھا۔ چونکہ مجاوروں کے پاس کوئی کرسی یا صوفہ نہیں تھا اس لئے ان کے پاس چھری کانٹے بھی نہیں تھے۔ تاہم مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ میں تمام مغربی تکلفات کو بھول گیا اور قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ لوہے کی پلیٹ (یعنی تھالی) گھٹنوں پر رکھی اور انگلیوں سے چاول اور کری کھانے لگا۔ کھانے کا یہ خاص مشرقی انداز ہے۔

کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کیا۔ اس کے بعد میں میلہ دیکھنے کے لئے اپنی قیامگاہ سے باہر نکلا۔ سخی سرور کے تمام گلی کوچے، مکانوں کی چھتیں اور دوسری عمارتوں کے چھجے سب کے سب لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انسانوں کا ایک سیلاب ہے جو مسلسل اُمڈتا چلا آ رہا ہے۔ کچھ لوگ نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے تو کچھ ظاہر ہو رہے تھے۔ لوگوں کے ہجوم میں سے ہوتا ہوا میں حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر پہنچا۔ یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ یہ لوگ بزرگ کی عقیدت کی وجہ سے یہاں جمع نہ تھے اور نہ ہی ان میں کوئی قرآن کی آیات پڑھ رہا تھا بلکہ ان کا مقصد ان ناچنے والیوں کا ناچ دیکھنا تھا جن کو خانقاہ کے مجاوروں نے دوپہر کی نماز کے بعد سے اپنے کام پر لگا دیا تھا۔ تماشائی ان کے رقص سے لطف اٹھا رہے تھے اور ان کی تعریف کر رہے تھے۔ ناچنے والیوں کا لباس عام وضع کا تھا۔ وہ پھولوں کے ہار اور گجرے بھی پہنے ہوئے تھیں، اپنی اداؤں سے تماشائیوں کے من کو لبھا رہی تھیں۔ ان ناچنے والیوں اور مراثیوں کا خانقاہ سے خاص تعلق ہے۔ وہ اپنے ناچ گانوں کے ذریعے زائرین سخی سرور کے روحانی جذبات میں ہیجان کرنا چاہتی ہیں۔ کوئی جنسی انگیخت ان کا مقصد نہیں۔ جو گانے یہاں گائے جاتے ہیں ان کی وضاحت بڑے روحانی انداز میں کی جاتی ہے۔ بالعموم فارسی زبان کے مشہور صوفی شاعر حافظ شیرازی کی غزلیں بڑے والہانہ انداز میں گا کر سنائی جاتی ہیں۔ جب میں گانا سننے کھڑا ہوا تو ایک معروف فارسی غزل گائی جا رہی تھی جس کی ردیف "تازہ نہ تازہ" ہے۔ اس غزل میں

عشق وسرمستی اور وجد وسرور کا بیان ہے[1]

خانقاہ کی تعمیر میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ تمام مشرقی مقبرے، خانقاہیں اور زیارتگاہیں سی وضع قطع کی بنائی جاتی ہیں۔ خانقاہ کے اندر حضرت سخی سرور اور ان کی اہلیہ محترمہ، بی بی بائی کے مزارات ہیں۔ جن جسکو حضرت سخی سرور نے شکست دے کر مارا تھا، اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھی آپ کے پہلو میں لیٹا ہوا ہے۔

ایم میکالف لکھتے ہیں[2] کہ میں نے سنا ہے کہ پاک و ہند کے بعض علاقوں میں جنّ اُتارنے کی غرض سے عورت کو خوب مارا جاتا ہے لیکن حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر ایسا نہیں کیا جاتا۔

خانقاہ سے پلٹا تو میں اپنے خیمے میں چلا آیا، جو نی لگی کے قریب نصب تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے آرام کیا۔ چاروں طرف سے شور وغل کی صدائیں آرہی تھیں۔ کہیں ڈھولیوں نے طوفان برپا کر رکھا تھا تو کہیں سازندے اپنے سازوں سے اور بعض مقامی باشندے اپنے نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

دوسرے دن میلہ ختم ہو گیا اور تمام لوگ قطار اندر قطار سخی سرور سے روانہ ہونے لگے۔ میں واپسی میں تھوڑی دیر کے لئے وڈور کے مقام پر ٹھہر گیا جہاں ابھی میلے کی رونق باقی تھی۔ حضرت سخی سرور کے بھائی سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا کی یہاں ایک زیارت ہے۔ یہاں کچھ لوگ ناچنے گانے میں مصروف تھے۔ ان میں پیشہ ور طوائفیں بھی تھیں۔ گو مسجدوں یا خانقاہوں میں ناچنا اور گانا اسلام میں جائز نہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ مسجدوں یا خانقاہوں کے مہتمموں کو اچھی خاصی رقم دیتے ہیں اس لئے مذہب میں تھوڑی سی ترمیم یا بے قاعدگی کو بھی جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔

آخر میں ایم میکالف لکھتے ہیں[3] کہ سخی سرور اور وڈور کی زیارت گاہوں پر میں نے

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: CALCUTTA REVIEW, P 82-83

[2] CALCUTTA REVIEW, VOL 60, P 96-99.

[3] CALCUTTA REVIEW, VOL 60, P 99-102.

جو میلہ دیکھا اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شراب نوشی، بدمعاشی یا چوری چکاری نہیں ہوتی۔ اور یہ نتیجہ ہے ان مجاوروں کی کوششوں کا جو یہاں رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کہ اس قسم کی بے ہودگیوں سے خانقاہ کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دربار کی تقدیس آناً فاناً ختم ہو سکتی ہے اور اس زیارت گاہ کو برصغیر پاک و ہند میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے وہ ذرا سی دیر میں مٹ سکتی ہے۔ پس وہ ہر وقت اس امر میں کوشاں نظر آتے ہیں کہ ایسے کام کئے جائیں جن سے حضرت سخی سرور کے دربار کا وقار رہتی دنیا تک قائم رہے۔

۶۔ لدھیانہ اور بعض دوسرے مقامات پر میلے

جیسا کہ اس باب کے شروع میں بیان ہُوا ہے حضرت سخی سرور کی یاد میں اور بھی کئی مقامات پر میلے لگتے ہیں۔ ان مقامات کا تعلق زیادہ تر ہندوستان کے اس حصے سے ہے جس کو آج کل بھارت کہا جاتا ہے۔ سر ڈینزل ابٹسن اور ایڈورڈ مکلیگن لکھتے ہیں[1] کہ موگا میں حضرت سخی سرور کی ایک زیارت ہے جو نگاہہ پیر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ زیارت ۱۸۶۹ء میں پٹیالہ کے کسی باشندے نے بنوائی تھی۔ اس کے اندر کوئی تصویر نہیں ہے۔ یہ ایک اونچے پلیٹ فارم یا چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ یہاں چیت اور اسوج کے مہینوں میں مسلسل آٹھ جمعراتوں کو میلہ لگتا ہے۔ میلے کے دنوں میں اس زیارت پر نقدی یا "چُوری" وغیرہ کی قسم کے نذرانے چڑھائے جاتے ہیں۔

حضرت سخی سرور کی ایک اور معروف زیارت نگھا میں ہے۔ جہاں پھاگن کے مہینے میں کسی چاندنی جمعرات کو میلہ لگتا ہے۔ یہاں اس زیارت سے پرستش کی حد تک عقیدت کی جاتی ہے۔ کوئی دو سو سال قبل مانسہ کے کسی سردار نے اس زیارت کو تعمیر کرایا تھا۔ کہتے ہیں یہ سردار کبھی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اسے خواب میں بشارت ہوئی کہ حضرت سخی سرور

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. ‘ GLOSSARY, VOL 1, P 570.

کے نام ایک زیارت بنائی جائے، اس کے بعد پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ چنانچہ اس نے خواب کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک زیارت بنوائی۔ ہندو مسلمان دونوں قوموں میں یہ زیارت مقبول ہے۔ ہر فصل کی کٹائی سے جو غلہ میسّر آتا ہے۔ اس کا کچھ حصّہ بطور نذرانہ اس زیارت پر چڑھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری صورتوں مثلاً نقدی وغیرہ میں بھی چڑھاوے دیئے جاتے ہیں۔ اس زیارت کے ساتھ ایک سبیل بھی ہے۔ یہاں کے باشندے خصوصاً مسافر تبرکاً سبیل کا پانی پیتے ہیں۔ میلے کے ایام میں زائرین کو مفت کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اس زیارت کا مجاور، جو عام طور پر برہمن ہوتا ہے، ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے۔

لدھیانہ میں بھی حضرت سخی سرور کی ایک خانقاہ ہے جو خاصی مشہور ہے۔ یہ خانقاہ خاص لدھیانہ میں تو نہیں ہے بلکہ لدھیانہ کی تحصیل سمرالا کے مقام بھاولا میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال جیٹھ کی پہلی جمعرات کو ایک بھاری میلہ لگتا ہے جسے بھاولا میلہ کہتے ہیں۔ یہ میلہ حضرت سخی سرور کا یوم وفات منانے کی غرض سے منعقد ہوتا ہے۔ اس خانقاہ میں حضرت سخی سرور کے مزار کا کتبہ[1] بھی موجود ہے۔ میلے میں شریک ہونے والے زائرین میں سے اکثر اس خانقاہ پر ایک بڑا روٹ پکاتے ہیں۔ جب روٹ پک کر تیار ہو جاتا ہے تو خانقاہ کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ خانقاہ کے منتظمین کچھ حصہ تو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور باقی غرباء میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس خانقاہ کا انتظام گھمن جاٹوں[2] اور بھرائیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لوگ خانقاہ کے چڑھاووں کی آمدنی کی مساوی طور پر آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

---

[1] (GLOSSARY, VOL 1, P 570.- "CENOTAPH"
PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135.)

[2] بعض جگہوں پر یہ مرقوم ہے کہ اس خانقاہ کا انتظام کمہاروں کے ہاتھ میں ہے۔ (مثلاً دیکھیں:
LUDHINNA - اور LUDHIANA GAZETTEER, 1888-89, P 78.
-GAZETTEER, 1904, P 54.) قیاس چاہتا ہے کہ یہ کمہار گھمن جاٹوں میں سے ہوں گے۔

چمبا[1] میں بھی حضرت سخی سرور کی زیارتوں کا پتا ملتا ہے جہاں بڑی دھوم دھام سے ہر سال میلے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہاں پر کم و بیش ویسی ہی رونق ہوتی ہے جیسی حضرت سخی سرور کے دربار واقع ڈیرہ غازی خاں کے سالانہ عرس میں نظر آتی ہے۔ گو اس خیال میں خاصا مبالغہ پایا جاتا ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ یہاں کے میلوں میں خاصی گہما گہمی اور چہل پہل ہوتی ہے۔ چمبا کی زیارتوں کے نگہبان ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ یعنی دونوں قوموں کے افراد مشترکہ طور پر ان زیارتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ من حیث المجموع اکثر زیارتوں کے محافظ مسلمان ہیں اور گنتی کی چند ایک زیارتوں کے پاسبان ہندو ہیں۔ مثال کے طور پر باری کا، جو چنجو کا ایک قصبہ ہے، پجاری ایک بلّو برہمن ہے۔ اسی طرح پھرلہ[2] واقع ہمگری کا مجاور بھی ایک ہندو ہے جو رٹھی[3] کہلاتا ہے۔ لیکن اس کا چیلہ ایک مسلمان ہے۔ مجاوروں کی مجاوری موروثی ہے۔ یہاں جو میلے لگتے ہیں ان میں اور بہت سے کھیل تماشوں کے علاوہ کشتیوں کے زبردست مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔

ناھن میں بھی حضرت سخی سرور کی ایک خانقاہ ہے جہاں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ مقامی باشندوں کے علاوہ آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ اس میلے میں شرکت کرتے ہیں۔ حضرت سخی سرور کے عقیدت مندوں میں یوں تو مرد اور عورتیں سبھی شامل ہیں لیکن مشرقی پنجاب میں آپ کی عقیدت زیادہ تر عورتوں میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ جٹی دانی کا مشہور واقعہ اسی علاقے سے وابستہ ہے[4]۔

---

[1] (PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. 'GLOSSARY, VOL 1, P 570.) CHAMBA.

[2] (ایضاً) PHURLA.

[3] (ایضاً) RATHI.

[4] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. 'GLOSSARY, VOL 1, P 571.
LEGENDS OF THE PUNJAB

پنجاب کے علاوہ یو پی کے بعض علاقوں میں بھی حضرت سخی سرور کی زیارتوں اوران پر ہونے والے میلوں کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ سہارن پور میں جہاں سے یو۔ پی کی سرحد شروع ہوتی ہے، آپ کی ایک زیارت موجود ہے۔ یہاں کچھ جوگی آپ کی پرستش کرتے ہیں جن کو فریڑ[1] کہا جاتا ہے۔ یہ جوگی کم سنی یعنی تقریباً دس بارہ سال کی عمر میں خانقاہ کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں اور اس موقع پر ایک مختصر سی رسم ادا کی جاتی ہے۔ بعدازاں یہ جوگی اس خانقاہ پر مدت العمر قیام کرتے اور پوجا پاٹ میں مصروف رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا اندراجات سے پتا چلتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں خصوصاً مغربی اور مشرقی پنجاب کی اکثر جگہوں پر حضرت سخی سرور کی زیارتیں یا خانقاہیں موجود ہیں جہاں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہر سال کوئی نہ کوئی میلہ لگتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشہور عرس اور میلے وہی ہیں جن کا تعلق دھونکل، پشاور، لاہور اور ڈیرہ غازیخاں سے ہے اور جن کا مفصل ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

لہ (NORTH INDIAN AND QUERIES, VOL IV, P90. "FARYAR" PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. ' GLOSSARY, VOL 1, P 571.)

آٹھواں باب

زیارت سخی سرورؒ

ہم مریدین حضرت سخی سرور کے باب میں لکھ چکے ہیں کہ حضرت سخی سرور کے عقیدتمندوں یعنی سلطانیوں کی سب سے بڑی رسم آپ کے روضہ مبارک کی زیارت ہے جو ڈیرہ غازیخاں میں اس جگہ واقع ہے جس کو آج کل "سخی سرور" کہا جاتا ہے۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کئی ایک کتابوں میں اس زیارت کے متعلق تفصیل سے مرقوم ہے[۱] سر ڈینزل ابٹسن اور ایڈورڈ مکلیگن لکھتے ہیں[۲] کہ حضرت سخی سرور کی خانقاہ کی زیارت برّصغیر پاک و ہند کا ایک نمایاں فیچر ہے جو نقل کرنے کے قابل ہے۔ سال کے ابتدائی مہینوں میں زائرین کی مختلف جماعتیں مسلسل بہتی ہوئی ندیوں کی طرح نگاہہ (سخی سرور) کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ان میں مذہب و ملّت کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ مسلمان، ہندو، سکھ سبھی قوموں کے لوگ بکثرت شامل ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں مسٹر پرسر[۳] نے جالندھر ڈویژن کے سرکاری گزیٹئر میں جو کچھ بیان کیا ہے،

۱ھ مثال کے طور پر دیکھیں: خلاصۃ التواریخ، ص ۶۱-۶۲۔ ہفت تماشائے قتیل، ص ۹۲ - دربار ملّی، ص ۳۶۰۔ تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۳-۴۶۔ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P135-136، JULLUNDER GAZETTEER, 1904, P124. اور GLOSSARY, VOL 1, P566-73. وغیرہ۔

۲ھ PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135. GLOSSARY, VOL1, P569-71.

GAZETTEER, 1904, P 124.

۳ھ MR. PURSER.

بڑا ہی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] کہ حضرت سخی سرور کے زائرین کی اس جماعت کو جو ڈیرہ غازی خاں کی طرف بڑھتی ہے، اصطلاح میں "سنگ"، کہتے ہیں۔ راستے میں جہاں جہاں یہ سنگ قیام کرتا ہے اس مقام کو چوکی کہا جاتا ہے۔ زائرین کا سب سے بڑا راستہ مندرجہ ذیل دیہات سے ہو کر گزرتا ہے۔

ہانسروں[2]۔ مکند پور۔ کلیتا[3] یا بڑا پنڈ۔ بوپارائے (پھلور[4])۔ رڑکی کلاں۔ بندالہ[5] جنڈیالا۔ بوپارائے (نکودر)۔ خیر پور اور وہاں سے سلطان پور۔

اس راستے پر "سنگ" کے ساتھ جو حقیقت میں گڑھ شنکر[6] واقع ضلع ہوشیار پور کے زائروں سے مل کر بنتا ہے، دریائے ستلج کے جنوبی اضلاع اور ضلع جالندھر کے زیریں علاقوں سے زائرین آملتے ہیں۔

زائرین کے اس سنگ کو "کالی کملی" کے مخصوص نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود کو سردی سے بچانے کے لئے اکثر زائرین کالے کمبلوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔

اس سنگ کا ایک اور بڑا روٹ (راستہ) آدم پور۔ جالندھر۔ کپور تھلہ۔ ویرووال[7] سے گزرتا ہے۔ اس راستے پر دواب کے شمالی علاقوں سے چلنے والے زائرین آتے ہیں۔ جہاں تک کرتارپور کے زائرین کا تعلق ہے، وہ وہاں جمع ہو کر کپور تھلہ کا رخ کرتے ہیں۔

زائرین اس سفر کے دوران بستر پر سونے کی بجائے زمین پر سوتے ہیں اور اپنے منہ ہاتھ یا کپڑے وغیرہ اس وقت تک نہیں دھوتے جب تک زیارت مکمل نہیں ہو جاتی۔ بعض زائرین تو زیارت سے واپس آکر اپنے گھروں میں منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس مقدس سفر میں جو دھول ان کے جسم پر جمتی ہے بڑی پاک اور پوتر ہوتی ہے۔

ھ۱ JULLUNDER.

ھ۲ HÁNSRON

ھ۳ KULETA

ھ۴ PHILLAUR

ھ۵ BANDÁLA

ھ۶ GARH SHANKER

ھ۷ WAIROWÁL

مختلف علاقوں سے زائرین کی جو چھوٹی چھوٹی جماعتیں نکل کر سنگ کی صورت اختیار کرتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سرکردہ ایک مسلمان ہوتا ہے جو بھرائی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ تمام زائرین ایک دوسرے کو پیر بھائی، پیر بہن یا پیر بھائی بہن سمجھتے ہیں۔ جو لوگ کسی وجہ سے زیارت کو جانے والی اس سنگ کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ عام طور پر زائرین کی مختلف چوکیوں میں سے کسی ایک چوکی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر چوکی تک پہنچنے سے بھی وہ قاصر ہوں تو اپنے گاؤں سے نکل کر کسی اور گاؤں چلے جاتے ہیں اور کم از کم ایک رات اس دوسرے گاؤں میں گزار کر اپنے گھر واپس آجاتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ گھر سے نکلنے سے بھی معذور ہوں تو اپنے گھروں کے اندر ایک رات ضرور بستر کی بجائے زمین پر سوتے ہیں۔ وہ اپنے اس عمل کو اپنی دانست میں زیارت کا نعم البدل سمجھتے ہیں۔

نگاہہ (سخی سرور) کی زیارت بالعموم کوئی منت ماننے کی وجہ سے اور یا کسی منت کے پورا ہونے پر چڑھاوا چڑھانے کی خاطر کی جاتی ہے۔ سفر کے دوران زائرین کا اپنا علیحدہ نظم و نسق ہوتا ہے، جس کو خود ساختہ حکومت بھی کہہ سکتے ہیں۔ زائرین کے اس سنگ میں دو بڑے فریق شامل ہوتے ہیں۔ ایک کو چک چیلہ[1] اور دوسرے کو کنگ چیلہ یا کنگ کلاں[2] کہا جاتا ہے۔ ان دونوں فریق کے پیشوا یا لیڈر ہر رات ایک اسمبلی منعقد کرتے ہیں جو دیوان کہلاتی ہے۔ اس دیوان میں مقدمات فیصل کئے جاتے ہیں۔ چک چیلہ اور کنگ چیلہ کے لیڈروں کو اس سلسلے میں بلگا[3]، جنڈیالا، بڑا پنڈ اور دوسرے دیہات کے لوگوں کی حمایت اور امداد حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ دونوں فریق خاصے بڑے اور اہم ہیں اس لئے دونوں کے لیڈروں کے درمیان تعصب اور عداوت ہے لیکن من حیث المجموع چک چیلہ کو فوقیت اور برتری حاصل ہے[4]۔

۱ے CHAK CHELA. ۲ے KANG CHELA (KANG KALÁN)

۳ے BILGA ۴ے JULLUNDER GAZETTEER, 1904, P 124.-

نیز دیکھیں: GLOSSARY, VOL 1, P 570-71 اور PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 135.

منشی سبحان رائے اس ذیل میں اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں لکھتے ہیں[1] کہ برّصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے سے خلائق کا ہجوم حضرت سخی سرور کے مزار واقع سخی سرور (ڈیرہ غازیخاں) کی زیارت کو آتا ہے۔ تمام زائرین مختلف منتیں مانتے اور نذریں چڑھاتے ہیں۔ اپنی مرادوں کے حصول کی استدعا کرتے ہیں اور بفضل تعالیٰ ان کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں۔ موسم سرما کے اواخر سے خلائق کا اژدحام قابلِ دید ہوتا ہے۔ ملتان سے مزارِ مقدس یعنی تقریباً چالیس کوس سے زیادہ مسافت تک تمام راستہ زائرین سے اتنا پُر ہوتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا[2]

حسن قتیل اپنی کتاب ہفت تماشا میں رقمطراز ہیں[3] کہ جس طرح نچلے طبقے کے مسلمان اور دوسری اقوام کے لوگ اپنے ہاتھوں میں مختلف نشان لئے، نزدیک اور دور سے شاہ مدار کے مزار پر جمع ہوتے ہیں اسی طرح ہر سال تقریباً ہر شہر کے باہر حضرت سخی سرور کے نشان اور علم نصب کئے جاتے ہیں۔ بھرائی قوم کے افراد، جو زیادہ تر مسلمان ہوتے ہیں، ان نشانوں کے نیچے کھڑے ہو کر ڈھول بجاتے اور حضرت سخی سرور کی مدح میں گیت گاتے اور ناچتے ہیں۔ ان کا ناچ اتنا دلربا ہوتا ہے کہ بہت سے تماشائی بھی ناچنے لگتے ہیں۔ تماشائیوں میں سبھی اقوام کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ہندو اور مسلمان کی کثرت ہوتی ہے۔ دوکاندار قسم کے لوگ جلب منفعت کی خاطر سفید یا رنگ برنگے شامیانوں کی چھوٹی بڑی دکانیں سجاتے ہیں اور مٹھائیوں اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں کا خوب کاروبار کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ساری رات ھاوھو کے ہنگامے میں گزر جاتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو زائرین کا قافلہ نگاہہ (سخی سرور) کی سمت روانہ ہوجاتا ہے۔ بعض لوگ خواہ وہ حضرت سخی سرور کے معتقد ہوں یا نہ ہوں

---

[1] خلاصۃ التواریخ، ص ۶۲

[2] از شہر ملتان تا مزار کہ فاصلہ زیادہ از چہل کروہ واقع است تمام راہ آدم آمود می شود۔ وہجوم خلائق در آن راہ آن قدر می شود کہ بتحریر راست نمی آید۔ (خلاصۃ التواریخ، ص ۶۲)

[3] ہفت تماشائے قتیل، ص ۹۱-۹۲ - نیز دیکھیں دربار ملّی، ص ۳۶۰-

شہر کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوکاندار بھی اپنی چیزوں کو فروخت کرنے کے بعد قافلے سے کٹ کر واپس آجاتے ہیں۔ البتہ بھرائی اور دوسرے مراد طلب لوگ سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعض طوائفیں بھی منافع حاصل کرنے کی غرض سے اس قافلے کے ہمراہ ہو جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جگہ جگہ سے زائرین نگاہہ (سخی سرور) کو جاتے ہیں اور وہاں پران کی کثرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کا شمار میں لانا مشکل ہے۔

تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں بھی کچھ اسی قسم کے اندراجات ہیں[1]۔ ان سے مقتبس ہوتا ہے کہ نگاہہ میں حضرت سخی سرور کے زائرین کی کثرت ناقابل بیان ہوتی ہے اور غالباً یہی کثرتِ تعداد تھی جس نے ۱۸۹۱-۱۸۹۲ء کی مردم شماری پر بھی اثر ڈالا تھا۔ ایڈورڈ مکلیگن اس عنوان سے کہ حضرت سخی سرور کی زیارت کا مردم شماری کی رپورٹ (۱۸۹۱-۱۸۹۲ء) پر اثر پڑا تھا، لکھتے ہیں[2] کہ سب سے زیادہ اہم بات جو دکھائی دی وہ حضرت سخی کے زائرین کا ہجوم تھا جو آپ کے مزار واقع نگاہہ (سخی سرور) کی طرف مسلسل بڑھتا چلا آتا تھا، جہاں ہر سال بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ میلے کی عام تاریخ پہلی بیساکھ ہے۔ اس سال (۱۸۹۱ء) یہ میلہ گیارہ بارہ اپریل کو منعقد ہوا۔ حضرت سخی سرور کے زائرین مل کر سفر کرنے کے خیال سے مقررہ دنوں میں مخصوص مقامات پر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی ان جماعتوں کو یا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں "چوکی میلوں"، کو روکا نہیں جا سکتا۔ نگاہہ (سخی سرور) کے زائرین کے جگہ جگہ جمع ہونے کی اطلاعات، مردم شماری کی رات کے موقع پر، مختلف اضلاع مثلاً ہوشیارپور، جالندھر، امرتسر گوجرانوالہ اور ڈیرہ غازی خاں وغیرہ سے موصول ہوئیں جس کی وجہ سے رپورٹ کا مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔

حکومت پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ متعلقہ ڈیرہ غازیخاں میں مرقوم ہے[3] کہ حضرت

---

[1] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۵-۴۶

[2] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 29.

[3] DISTRICT CENSUS REPORT. DERA GHAZI KHAN 1961ء

سخی سرور کے زائرین کی مختلف ٹولیاں پاکستان کے مختلف شہروں سے باہر نکلتی ہیں اور ایک سنگ یعنی جلوس کی شکل میں ناچتی گاتی مزار مبارک کی زیارت کو جاتی ہیں۔ ان جماعتوں کے نمایندوں یعنی بھرائی قوم کے افراد کے ہاتھوں میں سبز رنگ کے جھنڈے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ حضرت سخی سرور کے زائرین کا ایک خاص انداز ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہوتے اپنے روحانی پیشوا کے مزار مبارک کی زیارت کو جاتے ہیں۔ زائرین کی جماعتیں صرف ڈیرہ غازی خاں ہی نہیں جاتیں بلکہ دوسرے مقامات کی طرف بھی جاتی ہیں جن کا تعلق حضرت سخی سرور سے ہے یعنی ان جگہوں کا رخ بھی کرتی ہیں جہاں آپ کے نام پر چھوٹی چھوٹی زیارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ آپ کے نام پر برصغیر پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے تقریباً ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی زیارت موجود ہے، جس کو عرف عام میں پیر خانہ کہا جاتا ہے اور جس کی نگہبانی بالعموم ایک مسلمان کے ذمے ہوتی ہے جو بھرائی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ اگرچہ جابجا حضرت سخی سرور کی زیارتیں موجود ہیں لیکن ان میں زیادہ اہم وہ ہیں جہاں سالانہ عرس یا میلے لگتے ہیں۔

آٹھواں باب

خانقاہ حضرت سخی سرور - ایک جائزہ

ڈیرہ غازی خان کوئی ۲۳ میل کے فاصلے پر ایک موضع ہے جو حضرت سخی سرور کی آمد سے قبل نگاہہ کہلاتا تھا لیکن آپ کی تشریف آوری کے بعد "سخی سرور" کے نام سے مشہور ہوا اسی موضع میں آپ کی آخری آرامگاہ واقع ہے۔ حضرت سخی سرور کی خانقاہ سے متعلق بہت سی کتابوں میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم تمام اہم کتابوں کے کچھ اقتباسات یہاں درج کر دیں۔ ان اقتباسات سے یہ فائدہ ہوگا کہ قارئین کو خانقاہ کے بارے میں قدیم و جدید بیش قیمت معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ چنانچہ ذیل میں فرداً فرداً سب ماخذوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

منشی حکم چند تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں لکھتے ہیں[۱] کہ حضرت سخی سرور کی خانقاہ، جس کی ساری عمارت پختہ ہے۔ شہر ڈیرہ غازی خاں سے تخمیناً ۳۴ میل مغرب کی جانب، پہاڑ کے دامن میں ایک نہر کے کنارے واقع ہے جس کو مقامی باشندے "نی لگی" کہتے ہیں۔ خانقاہ کا پشتۂ شمالی یعنی سیڑھیاں "نی" کے اندر ہیں۔ اس کا دروازۂ کلاں جنوب کی جانب آبادی سے ملا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خانقاہ بادشاہ دہلی[۲] نے بنوائی تھی۔ بعد ازاں خانقاہ کی

۱۔ تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خاں، ص ۴۳، ۴۴۔

۲۔ بہت ممکن ہے کہ یہ بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہو۔ کیونکہ حضرت سخی سرور کی کرامات کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عیسیٰ خاں نامی ایک تاجر کے اونٹ کی ٹانگ۔

سیڑھیاں جو "نی گلی" سے اوپر کو چڑھتی ہیں دیوان لکھپت رائے[۵] اور دیوان جسپت رائے[۵] نے بنوائیں۔ ان کی تعمیر میں تقریباً ایک سال سے زیادہ عرصہ صرف ہوا، یہ سیڑھیاں آمدورفت کا کام نہیں دیتیں بلکہ ان کے ذریعے خانقاہ کی عمارت کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ نی گلی جس میں برسات کے دنوں میں خاصا پانی چڑھ آتا ہے، خانقاہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ دیوان لکھپت رائے اور دیوان جسپت رائے کی تعمیر کردہ سیڑھیاں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔

خانقاہ کے غربی دالان میں حضرت سخی سرور کی تربت ہے۔ مسقف کے نیچے چند ستون

ٹوٹ گئی تھی۔ آپ کی کرامت سے وہ درست ہو گئی۔ عیسیٰ خاں نے بادشاہ دہلی کو تمام ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے ازراہِ عقیدت کچھ رقم آپ کے نام وقف کردی۔ یہ خانقاہ اسی روپیہ سے تعمیر کی گئی۔ عیسیٰ خاں کے متعلق آر۔سی ٹیمپل نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں دہلی یا آگرے کا سوداگر تھا۔ دیکھیں، (LEGENDS OF THE PUNJAB) لہٰذا خانقاہ کی تعمیر کے لئے جس بادشاہ نے روپیہ وقف کیا، وہ اورنگ زیب عالمگیر ہی ہو سکتا ہے۔

۲،۱ کنہیا لال لکھتے ہیں: کہ دیوان لکھپت رائے اور دیوان جسپت رائے دونوں آپس میں سگے بھائی تھے اور صوبیدار لاہور، نواب زکریا خاں بہادر کے عہد میں حکومت پنجاب کے دیوان تھے۔ ان کی دولت مندی کا یہ حال تھا کہ دیوان لکھپت رائے نے جب اپنے لڑکے کی شادی کی تو لاہور میں ہر ہندو اور مسلمان کو ڈھائی ڈھائی سیر کھانڈ کا ایک ایک گنڈورا تقسیم کیا۔ یہ دونوں بھائی صاحبِ جائداد تھے۔ لاہور میں ان کی بہت سی زمینیں اور جائدادیں اب تک موجود ہیں۔ لاہور کا کوٹ لکھپت جہاں اب ایک نیا شہر آباد ہو گیا ہے، اسی دیوان لکھپت رائے کی ملکیت تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ لاہور، ص ۳۴۴، ۳۴۵)

حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر جو سیڑھیاں ان دو ہندو بھائیوں نے بنوائی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کے دل میں آپ کی بڑی عقیدت تھی۔

کھڑے ہیں۔ تیل کا چراغ خانقاہ میں رات دن جلتا رہتا ہے۔ خانقاہ کے شمال مغربی گوشے میں سکھوں کے پہلے مذہبی گورو بابا نانک کا استھان ہے۔ مشرقی جانب ایک کوٹھڑی میں حضرت سخی سرور کی اہلیہ محترمہ بی بی (بائی) کا پیڑا اور چرخہ رکھا ہے۔ ایک اور کوٹھڑی میں ہندوؤں کے دیوتا بھیروں کا ٹھکانا ہے۔ خانقاہ سے باہر لیکن چاردیواری کے اندر جال کا ایک خشک درخت ہے اور اسی طرف مغربی جانب چاردیواری کے باہر کنڈہ کا ایک سبز درخت موجود ہے۔ خانقاہ کے مجاوروں کا کہنا ہے کہ یہاں حضرت سخی سرور کی گھوڑی "لکی" بندھتی تھی۔ جال کے درخت کی جگہ اس کا اگلا کیلہ اور کنڈہ کے درخت کی جگہ پچھلا کیلہ ہوتا تھا۔

یہ روایت بھی عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت سخی سرور کی تربت ابتداً انہی دونوں درختوں کے درمیان تھی۔ بعدازاں نعش مبارک کو یہاں سے نکال کر اس جگہ دفنا دیا گیا جہاں آجکل آپ کا مزار ہے۔ احاطہ چاردیواری سے باہر دو کوٹھڑیاں ہیں۔ ایک آپ کے فرزند ارجمند سید راؤ سے دوسری آپ کے بھائی سید عبدالغنی المعروف شیخ ڈھوڈا سے متعلق ہے لیکن ان دونوں کوٹھڑیوں میں کوئی تربت نہیں ہے۔ خانقاہ سے مغرب کی کوئی دو ڈھائی سو کرم کے فاصلے پر، ایک اونچی پہاڑی کے اوپر آپ کے اصحاب میں سے دو کی قبریں ہیں، جن میں ایک کا نام میاں اسحاق اور دوسرے کا میاں نور ہے۔ ان قبروں سے مشرق کی طرف آپ کے دو اور ساتھیوں کی تربتیں ہیں۔ ان میں ایک کا نام میاں علی اور دوسرے کا میاں عثمان ہے۔ یہ قبریں کسی قدر پختہ بنی ہوئی ہیں لیکن ان کی وہ شان نہیں جو خانقاہ کی ہے۔ خانقاہ سے مشرق کی جانب ایک پختہ تالاب ہے جس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اسے نواب محمود گوجر نے بنوایا تھا۔ اس کی تیاری پر کافی لاگت آئی۔ یہ تالاب اکثر خشک رہتا ہے۔ بارش ہونے کی صورت میں کچھ پانی اس تالاب میں جمع ہو جاتا ہے جس سے چند دنوں کے لئے یہاں کے باشندوں کے لئے پانی کی کفایت ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خان، ص ۴۳

ڈیرہ غازی خاں کے سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے [۱] کہ خانقاہ کے موجودہ مجاور حضرت سخی سرور کے خسر، گھنو خاں پٹھان، حاکمِ ملتان کے تین ملازموں کی اولاد میں سے ہیں۔ ان ملازموں نے عقیدت کے باعث خود کو خانقاہ سے وابستہ کر لیا تھا۔ ان کی اولادیں، کلنگ، کاہن، شیخ کے نام سے مشہور ہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پہ آ چکی ہے۔

اس خانقاہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں قوموں کے لوگ یکساں طور پہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ خانقاہ ایک پہاڑی ندی کے اونچے کنارے پر واقع ہے جس کے اندر سے خانقاہ تک بڑی خوب صورت سیڑھیاں چڑھتی ہیں۔ یہ سیڑھیاں جو خانقاہ کی حفاظت کرتی ہیں لاہور کے دو ہندو تاجروں نے اظہارِ عقیدت کے طور پہ بنوائی تھیں۔ خانقاہ کی عمارت میں حضرت سخی سرور کی تربت، بابا نانک کے استھان، مسماۃ بی بی بائی کے مقبرے کے علاوہ ایک ٹھاکر دوارہ ہے۔ اس لحاظ سے خانقاہ کو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے فنِ تعمیر کا امتزاج یعنی ملا جُلا نمونہ کہا جا سکتا ہے سکھوں کے عہدِ حکومت میں دیوان ساون مل نے جو ملتان کا گورنر تھا کسی بنا پہ غالباً تعصّب کی وجہ سے ہندوؤں کو خانقاہ کی زیارت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ حتّٰی کہ ہر ہندو پہ جو زیارت کو جاتا تھا، سوا روپیہ ٹیکس عائد کیا، لیکن فائدہ نہ ہوا، ہندو برابر خانقاہ کی زیارت کرتے رہے اور ساتھ ہی ٹیکس کی رقم بھی دیتے رہے۔

بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۸۳ء میں اچانک آگ لگ جانے کی وجہ سے خانقاہ کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ دو قیمتی ہیرے جو نادر شاہ نے اس خانقاہ کی نذر کئے تھے اور بعض دوسری قیمتی اشیا جو سلطان زمان شاہ نے چڑھائی تھیں، سب یا تو آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں یا گم ہو گئیں۔ بعد ازاں خانقاہ کی دوبارہ تعمیر کی گئی۔

سخی سرور کے تمام موضع کے مالیات خانقاہ کے حق میں معاف ہیں۔ یہاں کی تقریباً ساری اراضی مجاوروں کی ملکیت بتائی جاتی ہے جو اپنی کھیتی باڑی کا بہت ہی کم یعنی تخمیناً

---

[۱] GAZETTEER OF THE D.G.KHAN (REVISED EDITION) 1893-97, P 51-54.

چونسٹھواں حصہ خانقاہ کو دیتے ہیں - مجاور کے علاوہ جن دوسرے لوگوں نے یہاں زمینیں خرید رکھی ہیں وہ اپنی پیداوار کا پورا ٹیکس اور مالیہ خانقاہ کو ادا کرتے ہیں تمام مجاور اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہیں - کہا جاتا ہے کہ اس موضع کے اونٹ بڑی اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں - پورے برصغیر پاک و ہند میں ان کا جواب نہیں۔

سر ڈینزل ابٹسن اور ایڈورڈ میکلیگن لکھتے ہیں[1] کہ حضرت سخی سرور کی موجودہ خانقاہ جو نگاہہ (سخی سرور) میں واقع ہے، ایک پہاڑی ندی کے خاصے اونچے کنارے پر بنی ہوئی ہے ندی کے اندر سے بڑی خوبصورت سیڑھیاں خانقاہ کی طرف چڑھتی ہیں - کہا جاتا ہے کہ یہ سیڑھیاں لاہور کے دو ہندو تاجروں[2] نے خانقاہ کی حفاظت کے لئے تعمیر کرائی تھیں - خانقاہ کے اندر مغرب کی طرف حضرت سخی سرور کا مزار ہے - شمال مغرب کی جانب بابا نانک کا استھان ہے - مشرقی سمت میں آپ کی اہلیہ محترمہ بی بی بائی کا ایک سٹول اور ایک چرخہ رکھا ہے۔

خانقاہ کے موجودہ مجاور سرکاری رپورٹ کے مطابق حضرت سخی سرور کے خسر گھنو خان پٹھان حاکم ملتان کے تین ملازموں کی اولاد میں سے ہیں - ان ملازموں کے نام کلنگ، کاہن اور شیخ بتائے جاتے ہیں - مجاوروں کی کل تعداد ۱۶۵۰ ہے[3] - اس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی - تفصیل

---

[1] PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134. ، GLOSSARY, VOL 1, P 568-69.

[2] یعنی دیوان لکھپت رائے اور دیوان جسپت رائے جن کا حال پہلے گزر چکا ہے۔

[3] ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت سخی سرور کی وفات کے بعد آپ کی خانقاہ پر تین مریض، گوہرا، جزامی، جراف نگاہ، نابینا اور احمد خان افغان نامرد حاضر ہو کر صحتیاب ہو گئے پھر خانقاہ کے مجاور بن کر خدمت کرنے لگے - آجکل انہی کی اولاد خانقاہ کی مجاوری کرتی ہے - ان مجاوروں کو تین جماعتوں یعنی کلنگ، کاہن اور شیخ میں تقسیم کیا گیا ہے - ان کی کل تعداد ۱۳۵۰ بتائی جاتی ہے کہتے ہیں حضرت سخی سرور کی کرامت سے اس تعداد میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی - دیکھیں

PUNJAB AND ITS FEUDATORIES, P 134. ، GLOSSARY, VOL 1, P 569.

اور PUNJAB NOTES AND QUERIES, VOL III, NOTE 156.

اس تعداد کی یوں ہے ۔ کلنگ کی اولاد ۷۵۰ ، کاہن کی اولاد ۶۰۰ اور شیخ کی ۳۰۰ ۔ خانقاہ کے تمام چڑھاووں کی آمدنی ۱۶۵۰ مساوی حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے ۔ ہر شخص خواہ وہ عورت ہو، یا بچہ ، برابر کا حصہ لیتا ہے ۔ یہ بٹوارہ خانقاہ کے سالانہ عرس کے موقع پر ہوتا ہے جبکہ خانقاہ کا صندوق کھولا جاتا ہے ۔ یوں تو سارا سال خانقاہ پر زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے لیکن عرس کے موقع پر جو بالعموم اپریل میں ہوتا ہے ، یہاں کی چہل پہل اور گھما گھمی اپنا جواب نہیں رکھتی ۔

حکومت پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں تحریر[1] ہے کہ یہ خانقاہ بادشاہ دہلی (اورنگ زیب عالمگیر) کے روپیہ سے بنائی گئی تھی ، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔ ازاں بعد اس میں لکھا ہے کہ خانقاہ برصغیر پاک و ہند کی تینوں بڑی قوموں یعنی ہندو ، مسلم اور سکھ کے نزدیک قابلِ احترام ہے اور اس کی ساخت میں ان تینوں قوموں کے فنِ تعمیر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں دیوان ساون مل نے ، جو ملتان کا گورنر تھا ، ہندوؤں کو خانقاہ کی یاترا کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ یہاں تک کہ ہر ہندو یاتری پر سوا روپیہ ٹیکس عائد کیا لیکن کوئی فائدہ برآمد نہ ہوا ۔ ہندو بدستور ٹیکس کا روپیہ دے کر زیارت کرتے رہے ۔ کہا جاتا ہے ۱۸۸۳ء میں یہ خانقاہ آگ لگنے سے تباہ ہو گئی تھی اور بہت سے قیمتی ہیرے جواہرات جو نادر شاہ اور سلطان زمان شاہ کی یادگار تھے جل کر راکھ ہو گئے یا گم ہو گئے ۔ بعد ازاں خانقاہ کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ۔ موجودہ خانقاہ گویا نقشِ ثانی کی حیثیت رکھتی ہے ۔

منشی گوپال داس نے تاریخ گوجرانوالہ میں لکھا ہے[2] کہ اکثر معتبرین از روئے اسناد تحریری بیان کرتے ہیں کہ تین خانقاہیں بالکل فرضی ہیں ۔ اول خانقاہ ولی قندھاری واقع حسن ابدال ۔ دوم خانقاہ شیخ سندو واقع امروہہ اور سوم خانقاہ حضرت سخی سرور واقع نگاہہ

---

[1] DISTRICT CENSUS REPORT, D. G. KHAN, 1961, P1-21, TO 1-22.

[2] تاریخ گوجرانوالہ ، ص ۳۳

(سخی سرور) ڈیرہ غازی خاں، وہ کہتے ہیں کہ ان خانقاہوں میں کوئی بزرگ مدفون نہیں ہیں۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ منشی گوپال داس نے کن تحریری اسناد کی بنا پر یہ بیان تاریخ گوجرانوالہ میں درج کیا ہے۔ جہاں تک ہماری تحقیق و تفتیش کا تعلق ہے ہمیں ایسی کوئی تحریری سند دستیاب نہیں ہو سکی۔ چونکہ منشی گوپال داس کا یہ بیان بغیر کسی سند اور حوالے کے ہے اس لئے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ ہم یہ قبول کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ حضرت سخی سرور کی خانقاہ فرضی ہے اور اصلیت یا حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پہلی دو خانقاہوں یعنی خانقاہِ ولی قندھاری واقع حسن ابدال اور خانقاہِ شیخ سدو واقع امروہہ کے متعلق تو ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ خانقاہوں کے بارے میں ہم نے کوئی تحقیق نہیں کی، لیکن جہاں تک حضرت سخی سرور کی خانقاہ کا تعلق ہے" ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ خانقاہ فرضی نہیں حقیقی ہے۔

خانقاہ کی حالت اوقاف سے پہلے

عرس اور میلے کے باب میں ہم نے ایک انگریز ایم میکالف کے بیانات سے، جو سخی سرور کی خانقاہ پر ہونے والے سالانہ عرس سے متعلق ہیں۔ کچھ اقتباسات درج کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اوقاف کی تحویل میں آنے سے پیشتر خانقاہ پر کیا کچھ ہوتا تھا۔ گو ایم میکالف کے بیانات کا تعلق تقسیم ہند سے قبل کے زمانے سے ہے تاہم اس میں اور تقسیم ہند سے بعد کے زمانے میں کوئی خاص تفاوت نہیں سوائے اس کے کہ تقسیم ہند کے بعد زائرین میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کم بلکہ ختم ہو گئی۔
جہاں تک عرس کے موقع پر خانقاہ پر ہونے والے واقعات کا تعلق ہے وہ اوقاف کے قیام سے قبل ہر دور میں یکساں رہے ہیں۔ ایم میکالف کے درج کردہ چشم دید واقعات میں جو مناظر ہماری نظر سے گزرے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا دین، مذہب اور

اسلام سے ڈور کا بھی واسطہ نہیں۔ اوقاف سے پیشتر صرف حضرت سخی سرور کی خانقاہ کا ہی نہیں، کم وبیش تمام درباروں اور زیارت گاہوں کا یہی عالم تھا۔ مجاور دربار، یا خانقاہ کی سالانہ آمدنی تو بڑے دھوم دھام اور دھڑلے سے آپس میں تقسیم کر لیتے تھے، اور عرس بھی بڑی شان وشوکت اور طمطراق سے مناتے تھے لیکن خانقاہ کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کرتے تھے۔ خانقاہ سے حاصل ہونے والی رقم کا کوئی جائز مصرف نہ تھا۔ وہ محض چند حضرات کی جدی اور پشتی آمدنی بن کر رہ گئی تھی۔

منشی محمد الدین فوق مرحوم نے اپنی کتاب مآثر لاہور میں بزرگوں کے درباروں اور مزاروں کا ایک عمومی نقشہ پیش کیا ہے۔ نامناسب نہ ہو گا، اگر ہم ان کے خیالات کا خاکہ یہاں درج کر دیں۔ حضرت سخی سرور کی خانقاہ کی بھی محکمہ اوقاف کی تاسیس سے قبل یہی کیفیت تھی۔ وہ لکھتے ہیں[1]: کہ اکثر مزارات پر فاتحہ خوانی اور زیارت قبور سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے لہو ولعب، کھیل تماشہ، ناچ مجرا اور قوالی کی مجلسوں سے دل بہلایا جاتا ہے۔ افسوس! جو مقام عبرت حاصل کرنے اور موت سے غافل نہ ہونے کے لئے ہے، وہاں بھی حظ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا بلکہ بعض مزاروں پر تو قمار بازی، شراب خوری اور بھنگ نوشی کی دکانیں کھل جاتی ہیں اور ان مسلمانوں سے جن کو خیر الامم کہا گیا ہے اس قسم کی نامشروع اور خلاف تہذیب حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ ان کو مسلمان کہتے ہوئے بھی ایک صحیح العقائد مسلم کو شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔

زیارتِ قبور کے متعلق بعض ضعیف اور قوی احادیث کی وجہ سے علمائے اسلام میں اختلاف ہے، تاہم موت کو یاد کرنے کے لئے زیارتِ قبور گناہ کا باعث نہیں، لیکن بزرگوں اور صوفیوں کے مزاروں پر جن لغویات اور فواحشات سے کام لیا جاتا ہے، ان کو بدعت بلکہ گناہ قرار دینے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ علمِ تصوّف وسلوک کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم طریق اور سلوک کے

---

[1] نقوش لاہور نمبر ص ۱۴۱، ۱۴۳ بحوالہ مآثر لاہور، مؤلفہ منشی محمد الدین فوق مرحوم، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی۔

اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ اگر ان کے سمجھنے میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کی جائے تو ہدایت کی بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جاتے ہیں ...... احکام الٰہی کی بہ اخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے، دگرہیچ۔ اور جو اس کے علاوہ کچھ کرتا ہے وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور حسن سلوک سے ناآشنا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت سخی سرورؒ اور ان کے ہمعصر بزرگوں اور مابعد کے صوفیائے کرام نے لاہور اور دوسرے شہروں میں مذہب اور دین کی کچھ کم خدمت نہیں کی بلکہ عوام کو ایمان اور ایقان کی دولت سے مالا مال کیا۔ لیکن آج ان کے مزاروں پر کیا کچھ ہوتا ہے۔ کوئی جبیں سائی کرتا ہے، کوئی ایسی دعا مانگتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے حکم (ایاک نعبد و ایاک نستعین) کے مطابق مانگی جاسکتی ہے۔ پھر عرس کے دنوں میں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ قوالیاں ہوتی ہیں، رنگ برنگے کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ پہلے طوائفوں کے ناچ بھی ہوتے تھے اور ان کے قدر دان ان پر روپے نچھاور کرتے تھے لیکن حکومت نے ایک قانون کے ذریعے بزرگانِ دین کے مزاروں پر اس بدعت کو بند کر دیا ہے۔

سماع اور قوالی کا تو اب تک رواج ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے لیکن صوفیائے چشت اور دیگر طریقے کے اولیائ انسان کی روح کو تین چیزوں کا مشتاق سمجھتے ہیں: (الف) عبادت الٰہی (ب) حسن اور جمال اور (ج) خوش آوازی۔ مگر قوالی کی شرطیں اس قدر کڑی اور قوال اور حاضرین کے لئے اتنی زیادہ پابندیاں ہیں کہ ہر کس و ناکس اس کے سننے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اور طوائفوں، بے ریش قوالوں اور مزامیر کی قوالی کو تو قطعاً حرام کہا گیا ہے۔ ان شرطوں پر غور کیجئے اور پھر اپنی قوالیوں کو دیکھئے۔ ایک فرقہ تو سرے سے قوالی کا قائل ہی نہیں۔ لیکن جو گروہ قوالی کو غذائے روح تصور کرتا ہے، کیا وہ نہیں دیکھتا کہ قوال یا حاضرین میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو قوالی کی شرطیں پوری کرتا ہے بلکہ آج کل کی قوالی تو اپنی بدعات و خرافات کی وجہ سے منکرات شرعیہ کی ایک کھلی ہوئی شہادت ہے۔

آخر میں منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا چند سطور محض اس لئے لکھی گئی ہیں کہ صاحبانِ قبور اور مزاروں کے حالات تحریر کرکے قبر پرستی اور پیر پرستی کی دکانداری کو فروغ دینا مقصود نہیں بلکہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی اصلاح و درستی کی ضرورت ہے۔

خانقاہ کی حالت اوقاف کے بعد

اوقاف کا محکمہ حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی اکثر زیارتیں اور خانقاہیں، جن میں حضرت سخی سرور کی خانقاہ واقع ڈیرہ غازی خاں بھی شامل ہے، اس محکمہ کی تحویل میں آگئیں۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں اس محکمے کے دفاتر کھولے گئے۔ اس محکمے نے ہر خانقاہ کا معقول انتظام کیا۔ اس کے جمع خرچ کا اندازہ کرکے باقی ماندہ روپے کو تعمیری کاموں میں لگانا شروع کیا۔ خانقاہوں کی دیکھ بھال، ان کی مرمت اور سالانہ عرس کے انعقاد وغیرہ سے متعلق تمام امور کو محکمہ اوقاف نے بطریقِ احسن انجام دیا۔ محکمہ اوقاف کے اغراض و مقاصد کی یوں تو کوئی حد نہیں لیکن ان میں سے بعض چیدہ چیدہ مقاصد یہ ہیں کہ ان خانقاہوں کی آمدنی سے، جو اوقاف کی نگرانی میں ہیں، پاکستان کے مختلف مقامات پر دینی درسگاہیں قائم کی جائیں، مسجدوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور وہاں پڑھے لکھے اور سمجھدار عالم اور امام رکھے جائیں۔ نیز مسجدوں میں مکتب کھول کر لوگوں کو دینی تعلیم دی جائے۔ ہر مسجد میں قرآن خوانی اور اس کے درس کا باقاعدہ انتظام ہو اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار کی نواحی جگہوں میں سے کسی مقام پر اسلامی علوم و فنون کا ایک مثالی کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں علوم اسلامی سے متعلق ہر زبان کی نادر کتابیں جمع کی جائیں جو اصل تحقیق کے لئے سود مند اور کارآمد ہوں۔ اس کتب خانے کی تاسیس سے پاکستان خصوصاً لاہور کو وہ سعادت میسّر آجائے گی جو کسی زمانے میں بغداد کو حاصل تھی۔ اسلامی علوم کے پیاسے کشاں کشاں مختلف ممالک سے لاہور آئیں گے اور اپنے من کی پیاس بجھائیں گے۔

حضرت سخی سرور کی خانقاہ سے محکمہ اوقاف کو ہر سال جو آمدنی ہوتی ہے اس کا کچھ

حصہ تو خانقاہ کی دیکھ بھال پر صرف ہو جاتا ہے، کچھ سالانہ عرس کے انتظام اور اہتمام پر اور کچھ دوسرے نیک مقاصد کی بجا آوری اور دینی امور کی انجام دہی پر۔ اب حضرت سخی سرور کے سالانہ عرس میں وہ بدنظمی، افراتفری اور پراگندگی دکھائی نہیں دیتی جس کا عرس اور میلے کے باب میں ذکر ہو چکا ہے۔ عرس کے موقع پر کچھ دینی ماحول کا پتا چلتا ہے۔ خانقاہ کی زیارت کے لئے مردوں اور عورتوں کے واسطے الگ الگ راستے مقرر ہوتے ہیں، اور سبھی دین اور مذہب کے دائرے میں رہ کر خانقاہ کی زیارت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ اب نہ طوائفوں کے مجرے ہوتے ہیں، نہ ناچ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں، نہ قمار بازی، شراب خوری اور بھنگ نوشی کی دکانیں کھولی جاتی ہیں اور نہ غیر مشروع اور خلاف تہذیب حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے بلکہ ہر طرف ایک اسلامی رنگ نظر آتا ہے۔ حدِ نظر تک خانقاہ اور اس کے پس و پیش کا ماحول تقدیس و طہارت میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے محکمۂ اوقاف کے اس حسنِ انتظام سے زائرین کو حضرت سخی سرور کی بزرگی اور عظمت کا صحیح احساس ہوتا ہے اور ان کے دل فرطِ عقیدت سے جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ ہر ایک زائر بے ساختہ اپنی عقیدت کے نذرانے خانقاہ پر پیش کرتا ہے اور زیارت سے واپسی کے وقت اپنے دل میں آپ سے گہری عقیدت اور اسلام سے سچی محبت کے جذبات لے کر جاتا ہے۔

حضرت سخی سرور کی مذکورہ خانقاہ کے علاوہ آپ کی مشہور زیارت واقع دھونکل بھی محکمۂ اوقاف کے سپرد ہے۔[1] اس زیارت کو دھونکل کا دربار بھی کہتے ہیں۔ یہاں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ حضرت سخی سرور نے ایک زمانہ قیام فرما کر خدا کی عبادت کی تھی اور ساتھ ہی لوگوں کو رشد و ہدایت کا راستہ بتایا تھا۔ اس دربار سے جو آمدنی محکمۂ اوقاف کو ہوتی ہے وہ بھی خانقاہ کی آمدنی کی طرح متعدد دینی اور تعمیری امور کی انجام دہی پر صرف ہوتی ہے۔ یہاں بھی اوقاف نے زائرین کے لئے زیارت کی جملہ سہولتیں بہم پہنچا رکھی ہیں۔

سالانہ میلے کے موقع پر یہاں بھی اب کوئی بدعت نظر نہیں آتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو: DISTRICT CENSUS REPORT, GUJRANWALA, 1961, P I-22 TO I-23.

کتابیات

اُردو، فارسی و عربی کُتب

۱ - آب کوثر، شیخ محمد اکرام آئی سی ایس، مطبوعہ لاہور

۲ - آئین اکبری ج دوم، مرتبہ سید احمد خان -

۳ - اجمیر، پنڈت ہربلاس شاردا -

۴، الف - اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، دہلی ۱۹۱۴ء / کراچی ۱۹۶۳ء

۴، ب - ادب نامہ ایران - پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، مطبوعہ لاہور

۵ - اسرار الاولیأ، بابا فریدالدین گنج شکر - مطبوعہ لاہور

۶ - اسلامی تصوف اور اقبال، ڈاکٹر ابو سعید نورالدین، پی ایچ ڈی، کراچی ۱۹۵۹ء

۷ - الغزالی، مولانا شبلی نعمانی -

۸ - الفقر فخری، قلندر علی سہروردی، مطبوعہ لاہور -

۹ - القول الجمیل فی بیان ہو السبیل، ولی اللہ دہلوی - مطبع نظامی ۱۲۹۱ھ
و ترجمہ محمد سرور، لاہور ۱۹۵۷ء -

۱۰ - انوار اولیأ (کامل) رئیس احمد جعفری، مطبوعہ لاہور -

۱۱ - انوار اصفیا، مرتبہ ادارہ تصنیف و تالیف، مطبوعہ لاہور -

۱۲ - الانتباہ فی سلاسل اولیأ، شاہ ولی اللہ دہلوی -

۱۳ - باغ و بہار، مؤلفہ میر امن دہلوی -

۱۴ - بخاری شریف -

۱۵ - برکات علی پور المعروف خزانہ تیراہ شریف، مؤلفہ مولوی محبوب احمد المعروف خیر شاہ

حنفی نقشبندی مجددی، رجب المرجب ۱۳۲۶ھ امرتسر۔
۱۰ - بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے، اعظم گڑھ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء
۱ - تاریخ تصوف در اسلام، ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی، مطبوعہ تہران ۱۳۲۲ھ۔
۱ - تاریخ تصوّف اسلام، مصطفیٰ حلیمی پاشا، مترجمہ رئیس احمد جعفری، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء طبع اوّل۔
۱۹ - تاریخ فلاسفۃ الاسلام، علامہ محمّد لطفی جمعہ، مترجمہ میر ولی الدین، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۱ء۔
۲ - تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، مطبوعہ دہلی، رمضان ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء
۲۱ - تاریخ جہانگشائے جوینی، عطا ملک جوینی (گب میموریل سیریز)
۲۱-الف - تاریخ گوجرانوالہ، منشی گوپال داس، مطبوعہ ۱۸۷۴ء
۲۲-ب - تاریخ فیروز شاہی، مؤلفہ عفیف شمس سراج مترجمہ مولوی محمّد فدا علی طالب کراچی ۱۹۶۲ء
۲۳ - تاریخ ہند و پاکستان، ریاض الاسلام، پی ایچ ڈی، و عبدالقیوم ایم۔اے
سلور برڈٹ کمپنی، نیویارک۔
۲۴ - تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند (بھارت) ج اوّل، سید ہاشمی فرید آبادی، کراچی۔
۲۵ - تاریخ ہند (برائے مدارس)، سید ہاشمی فرید آبادی، مطبوعہ اورنگ آباد، دکن۔۱۹۲۹ء
۲۶ - تاریخ سندھ، ابوظفر ندوی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء
۲۷ - تاریخ فرشتہ، ج اوّل، محمد قاسم فرشتہ مترجمہ عبدالحی خواجہ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء
۲۸ - تاریخ لاہور، کنہیا لال، مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور، طبع اوّل۔
۲۹ - تاریخ جلیلہ، ابوالافضل غلام دستگیر، مطبوعہ لاہور۔ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۴۷ء
۳۰ - تاریخ ہندوستان، ج اول، مولانا ذکاء اللہ مطبوعہ علی گڑھ۔ ۱۹۱۶ء
۳۱ - تاریخ پشاور۔ منشی گوپال داس، مطبوعہ لاہور، ۱۸۶۹ء لغایت ۱۸۷۴ء
۳۲ - تاریخ مخزنِ پنجاب، مفتی غلام سرور لاہوری، مطبوعہ لاہور ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء
۳۳ - تاریخ اولیاءؒ، امام الدین۔

۳۴ - تواریخ ضلع ڈیرہ غازیخاں، منشی حکم چند مرتبہ ۱۸۷۵ء مطبوعہ ۱۸۷۶ء لاہور

۳۵ - تواریخ ضلع ملتان، منشی حکم چند، مطبوعہ لاہور، ۱۸۸۴ء -

۳۶ - تواریخ سیالکوٹ -

۳۷ - تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار مطبوعہ بمبئی ۱۳۲۵ھ مترجمہ

ملک محمد عنایت اللہ، مطبوعہ لاہور -

۳۸ - تذکرہ مشائخ کرام، محمد قاسم فرشتہ -

۳۹ - تذکرہ صوفیائے پنجاب، اعجاز الحق قدوسی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء بار اوّل.

۴۰ - تذکرہ غوث اعظم، مؤلفہ طالب ہاشمی مطبوعہ لاہور -

۴۱ - تذکرہ غوثیہ، گل حسین شاہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۸ء

۴۲ - تذکرہ علمائے ہند (فارسی) مولوی رحمان علی (مترجمہ محمد ایوب قادری مع مقدمہ از ڈاکٹر

سیّد معین الحق، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، بار اوّل -

۴۳ - تذکرہ اولیائے دکن، عبدالجبار خان، مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۳۲ھ -

۴۴ - تذکرہ مشائخ دیوبند، مولفہ مفتی عزیز الرحمٰن -

۴۵ - تذکرہ اولیائے نقشبند، محمد امین شرقپوری -

۴۶ - تذکرہ لباب اللباب، مولفہ عوفی، مرتبہ ایڈورڈ براؤن ۱۹۰۳ء -

۴۷ - توزک جہانگیری، مصنفہ نورالدین جہانگیر مترجمہ احمد علی سیماب، مطبوعہ کانپور (مطبع نظامی

۴۸ - تحقیقات چشتی، مولوی نور احمد چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء -

۴۹ - چچ نامہ، اسمٰعیل بن علی مترجمہ حفیظ الرحمٰن حفیظ، مطبوعہ بہاولپور ۱۹۳۸ء -

۵۰ - حکایات پنجاب مؤلفہ آرسی ٹیمپل، مترجمہ میاں عبدالرشید، جلد اوّل، دوم، سوم -

مطبوعہ مجلس ترقی ادب اُردو - لاہور طبع اوّل ۱۹۶۲ء -

۵۱ - حواشی چچ نامہ، ڈاکٹر داؤد پوتہ -

۵۲ - حدیقۃ الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری، مطبوعہ لاہور ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء -

۵۳ - خلاصۃ التواریخ ـــــ منشی سبحان رائے بھنڈاری ـــــ مطبوعہ دہلی ۱۹۱۸ء -

۵۴ - خزینۃ الاصفیاءؒ، مفتی غلام سرور، جلد اوّل مطبوعہ لاہور، جلد دوم مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ۔
۵۵ - دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد چہارم (اُردو) مقالات تصوّف مطبوعہ لاہور۔
۵۶ - دیوان فرخی (فارسی) فرخی سیستانی۔
۵۷ - دربارِ ملّی، منتخبہ و مرتّبہ شیخ محمّد اکرام و ڈاکٹر وحید قریشی، مطبوعہ لاہور۔
طبع اوّل ۱۹۶۱ء
۵۸ - ذکر کرام، مؤلفہ حفیظ الرّحمٰن بہاولپوری مطبوعہ محبوب المطابع۔
۵۹ - رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام، آئی سی ایس، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، ۱۹۵۸ء
۶۰ - رپورٹ مردم شماری بنگال۔
۶۱ - سبک شناسی، جلد اول و دوم، ملک الشعرا بہار، مطبوعہ تہران ۱۳۱۹ھ/۱۹۴۰ء
۶۲ - سوانح مولانا روم، مولانا شبلی نعمانی، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ طبع اوّل۔
۶۳ - سیر الاولیاءؒ (فارسی) امیر خورد (اردو) محمد مبارک العلوی دہلی ۱۸۸۴ء
۶۴ - سیر العارفین، شیخ جمالی۔
۶۵ - سوانح حیات حضرت سخی سرور (کتابچہ) ملک غوث خلیفہ دربار، مطبوعہ ڈیرہ غازیخان۔
۶۶ - سُلطان الہند غریب نواز، محمّد اجمل خاں، مطبوعہ الہ آباد، بار اوّل ۱۹۳۵ء
۶۷ - سیر الاقطاب، شیخ اللہ دیا چشتی، مطبوعہ لکھنؤ۔
۶۸ - سرزمین ملتان، نور احمد خاں فریدی۔ مطبوعہ ملتان، بار اوّل۔
۶۹ - سفینۃ اولیاءؒ، شہزادہ داراشکوہ، مطبوعہ لکھنؤ۔
۷۰ - سکینۃ اولیاءؒ، شہزادہ داراشکوہ، مطبوعہ لکھنؤ۔
۷۱ - شیخ عبد القدوس گنگوہی، اعجاز الحق قدوسی، مطبوعہ لاہور۔
۷۲ - شاہجہان نامہ، جلد سوم، محمّد صالح کنبوہ۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب اردو لاہور۔ ۱۹۶۰ء
۷۳ - طبقات الاولیا ترجمہ الطبقات الکُبرٰی، مؤلفہ عبد الوہاب شعرانی مترجمہ سیّد عبد الغنی وارثی۔ مطبوعہ کراچی۔ فروری ۱۹۶۵ء۔
۷۴ - عرس اور میلے، امان اللہ ارمان سرحدی، مطبوعہ لاہور۔

۷۵ - عبرت نامہ، مفتی علی الدین خلف مفتی خیر الدین، مؤلفہ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء/ ۱۹۱۱سمت
مطبوعہ پنجابی ادبی اکادمی لاہور ۱۹۶۱ء

۷۶ - فتوح السلاطین، عصامی بہ تصحیح محمد یوشع، مدراس ۱۹۴۸ء۔

۷۷ - فتوح البلدان، علامہ البلاذری، مترجمہ ابوالخیر مودودی، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۲۲ء

۷۸ - فخر الحسن، مؤلفہ شاہ فخر الحسن دہلوی، مطبوعہ دہلی۔

۷۹ - فوائد الفواد، ملفوظات سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء۔

۸۰ - قرآن پاک۔

۸۱ - قرآن اور تصوف۔

۸۲ - قول المستحسن فی شرح فخر الحسن، مولانا احسن الزمان حیدرآبادی۔

۸۳ - کتاب الہند، ابوریحان البیرونی۔

۸۴ - کشف المحجوب، شیخ ابوالحسن علی ہجویری مطبوعہ لاہور ۱۹۲۳ء
و ترجمہ اردو مطبوعہ لاہور ۱۳۷۴ھ

۸۵ - کیمیائے سعادت (فارسی) امام غزالی۔

۸۶ - گلستان، شیخ سعدی شیرازی، مطبوعہ تہران و مرتبہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی و
پروفیسر الف ڈی رازی۔ مطبوعہ لاہور۔

۸۷ - گلزار اولیاء، مولوی عبداللہ شاہ، حیدرآباد دکن۔ ۱۹۶۰ء

۸۸ - گزیٹر مغربی خاندیش۔

۸۹ - مثنوی مولانا روم، دفتر سوم، مطبوعہ تہران ۱۳۱۵ھ/ ۱۳۱۹ھ

۹۰ - مولانا روم تمثیل کی روشنی میں، مؤلفہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، مطبوعہ لاہور۔

۹۱ - مامقیماں، از مولانا سید علاؤالدین اودھی۔

۹۲ - معارج الولایت (قلمی)، شاہ معین الدین الملقب بہ عبداللہ خویشگی۔
مجموعہ آذر ۲۵ ربیع الثانی ۱۱۱۱ھ مجموعہ شیدانی

۹۳ - مکتوبات امام ربانی، مجدد الف ثانی، جلد اول۔ مترجمہ قاضی عالم الدین

مطبوعہ لاہور۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۳ء

۹۴ - مرقع ملتان، سید محمد اولاد گیلانی، مطبوعہ لاہور ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۸ء/ ۱۹۹۵ بکرمی۔

۹۵ - مختصر تاریخ فلسفہ یونان ۔

۹۶ - مکتوبات شیخ کلیم اللہ ۔

۹۷ - ملفوظات سید گیسو دراز ۔

۹۸ - مآثر لاہور، مؤلفہ محمد الدین فوق مرحوم - مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ۔

۹۹ - مدینۃ الاولیاءؒ مفتی غلام سرور لاہوری، مطبوعہ لاہور ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء۔

۱۰۰ - مانی الاسلام، اصغر علی روحی، مطبوعہ لاہور ۱۳۵۰ھ ۔

۱۰۱ - مصارع العشاق : تالیف شیخ ابی محمد جعفر بن احمد بن الحسین السراج -

الطبع الاولیٰ طبع فی مطبعۃ الجوائب ۔

۱۰۲ - نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء۔

۱۰۳ - حمعات مؤلفہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی مترجمہ محمد سرور لاہور ۱۹۴۶ء

۱۰۴ - ہدیہ دستگیر ترجمہ غنیۃ الطالبین، مصنفہ شیخ عبدالقادر جیلانی ۔

مترجمہ حافظ محمد عبدالعزیز نقشبندی، مطبوعہ لاہور اکتوبر ۱۹۶۲ء

۱۰۵ - یادگار چشتی، مولوی نور احمد چشتی مطبوعہ لاہور کرانیکل ۔

106. A Glossary of the tribes and castes of Punjab and N.W.F.P. vols. I, II, III, based on the census Report for the Punjab 1803, by late Sir Denzil Abbotson, KCSI and the census Report for the Punjab, 1892, by Sir Edward Maclagan, KCIE, CSL, and compiled by H.A. Rose of the Indian civil Service.
107. Cambridge History, vol. III.
108. Census Report for the Punjab, 1892 A.D.
109. Settlement Report.
110. Census of India, 1891.
111. District Census Report of Deraghazi Khan, 1961 compiled and issued under the authority of Ministry of Home & Kashmir Affairs (Home Affairs division) Govt. of Panjab.
112. District census Report, Peshawar, 1961, by A. Rashid, C.S.P.
113. District census Report Gujranwala 1961, by A. Rashid, CSP.
114. District census Report, Lahore, 1961, by A. Rashid, CSP.
115. ESSAI sur les origines du lexique technique de la Mystique Musulmanne, 1954 by Massiqnon.
116. Gazetteer of Dera Ghazi Khan District (Revised Edition) 1893-97, Punjab Govt. Lahore, 1898.
117. Gazetteer of Multan District, 1923-24 by Panjab Govt.
118. Gazetteer of Peshawar District, 1897-98, by Panjab Govt.
119. Gazetteer of Gujranwala District, 1893-94.
120. Gazetteer of Sahiwal (Montgomery) District.

121. Gazetteer of Jullunder District, 1904, by Panjab Govt.
122. Gazetteer of Ludhiana District, 1888-89, by Panjab Govt.
123. Gazetteer of Lahore District, 1893-94, by G.C. Walker, PCS, Settle- ment Collector.
124. Gazetteer of Lahore, 1916, by Panjab Govt.
125. Gazetteer of Hoshyarpur District.
126. History of Lahore, by Syed Mohammad Latif.
127. Introduction to the History of Sufism, by Dr. A.J. Arbery, London 1950.
128. Imperial Gazetteer, vol. II.
129. Indian Antiquary, vol. xi.
130. Mystics of Islam, by Prof R.A. Nicholson, London, 1914.
131. (*a*) Panjab and its Feudatories, by E.D. Maclagan Calcutta, 1892.
132. (*b*) Settlement Report by W.E. Purser.
133. (*c*) Settlement Report by T.G. Walker.
134. Spirit of Islam, by Syed Ameer Ali. London, 1949.
135. Sufism, by Dr. A.J. Arbery, London, 1950.
136. The Idea of Personality in Sufism, by Prof. R.A. Nicholson, Cambridge University, 1923.
137. The Doctrines of the Sufis, by Dr. A.J. Arbery.

رسائل، اخبارات، مکتوبات

۱۳۸ - اردو! اقبال نمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء نئی دہلی مضمون ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔
۱۳۹- اقبال، مجلّہ بزم اقبال، بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء و اپریل ۱۹۵۷ء۔
مضمون : ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔
۱۴۰ - اورینٹل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۲۵ء۔
۱۴۱ - مکتوب بنام مؤلّف از یوسف آفریدی، پشاور بابت ۴ ستمبر ۱۹۶۶ء۔
۱۴۲ - مکتوب بنام مؤلّف از طاہر ملی، ڈیرہ غازیخاں بابت ۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء۔
۱۴۳ - نظم الاوقات وکرایہ نامہ، گورنمنٹ روڈ ٹرانسپورٹ، لاہور ۱۹۶۳ء۔
۱۴۴ - نقوش، لاہور نمبر۔
۱۴۵ - نیرنگ خیال، بابت جون ۱۹۴۵ء۔ مضمون : نوراحمد فریدی، مؤلّف ملتان۔

146. Calcutta Review, vol Lx (60), 1875, Article by M. Macauliffe, B.A.,B.C.S.
147. Calcutta Review, vol Lxx III (73), 1881, Article by R.C. Temple.
148. North Indian Notes and Queries (Monthly Periodical) vol I to V, Edited by William Crooke, Esqr., C.S. Saharanpur, N.W.P. India.
149. Panjab Notes and Queries (Monthly Periodical) vol I to II, Edited by captain R.C. Temple Allahabad, (Pioneer Press) and London (Messers Trubner and Co).
150. Pakistan Times, Dated 16-6-66, Article by Anwar Hussain.
151. Pakistan Times, dated 21-10-66, Article by S.A. Vahid.

شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم	ترجمہ/زبان	قیمت
۱	کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ اوّل	عبدالرحمٰن الجزیری	منظور احسن عباسی	اُردو	50/-
۲	" " دوم	"	" "	"	40/-
۳	" " سوم	"	" "	"	45/-
۴	" " چہارم	" "	" "	"	—
۵	حضرات القدس (فارسی)	شیخ بدر الدین سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی)	مولانا محبوب الٰہی	—	15/-
۶	فوائد الفواد	ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء	پروفیسر محمد سرورؔ	اُردو	15/-
۷	المنقذ من الضلال (عربی)	امام غزالی	—	-	3/50
۸	تلاش حق	امام غزالی	خالد حسن قادری	—	3/-
۹	الانصاف (عربی)	شاہ ولی اللہ دہلوی			3/50
۱۰	دعوت اسلام	پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ	ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	اردو	15/-
۱۱	اسلام اور نظام جاگیرداری و زمینداری	مولانا مناظر احسن گیلانی	—	—	4/-
۱۲	تاریخ تصوف	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	—	—	
۱۳	تذکرہ سخی سرور	حامد خاں حامد	—	—	
۱۴	ارشادات نبویؐ	شاہد اللہ فریدی محمد میاں صدیقی		اردو انگریزی	3/50
۱۵	آداب شہریت	محکمہ اوقاف	—	—	2/50
۱۶	کتاب الفتوہ	شاہ علی ہمدانی	ڈاکٹر محمد ریاض	فارسی	2/50
۱۷	فیصلہ ہفت مسئلہ	حاجی امداد اللہ مہاجر مکی	—	اردو	-/50

شرح کمیشن : ۱ تا ۱۰۰ روپے تک ۲۵ فیصد | ۱۰۱ تا ۵۰۰ روپے تک ۳۳ فیصد | ۵۰۱ تا ۱۰۰۰ روپے تک ...

40%

علماء اکیڈمی (شعبہ مطبوعات) محکمۂ اوقاف پنجاب بادشاہی مسجد لاہور